فہرست

لمعات:

(عدلیہ اور استبداد)	ادارہ	3
ہمیں کیا ہو گیا ہے؟	ڈاکٹر صفدر محمود	5
بدلتی تاریخ	خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی	9
حضرت عمرؓ (قرآن کے سانچے میں ڈھلا ہوا انسان)	آغا شورش کاشمیری مرحوم	15
دینی مدارس اور حکومت	ایاز حسین انصاری، حیدر آباد	20
قرآن کے نظامِ عدل کے چند بنیادی اصول	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	28
سبعا من المثانی والقرآن العظیم	غلام باری، مانچسٹر	37

ENGLISH SECTION

JIHAD IS NOT TERRORISM (WAR)

by Ghulam Ahmad Parwez

English Rendering by Shahid Chaudhry 1

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

عدلیہ اور استبداد

انسانوں کے مفاد ہمیشہ آپس میں ٹکراتے چلے آ رہے ہیں اور اس ٹکراؤ سے باہمی کشمکش اور تنازعات کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔حکومت کے قیام کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایسے تنازعات وتزاحمات کوحسن وخوبی اور عدل وانصاف سے نپٹایا جائے لیکن عام طور پر دیکھا یہی گیا ہے کہ حکمرانی کی لذت اور اقتدار کا چسکا حکمرانوں کو ایک دوسری راہ پر ڈال دیتا ہے۔ جہاں عدل وانصاف اور فہم وبصیرت کی بجائے اپنی ذمہ داریوں سے بے نیاز ہوکر، وہ حرص اور خودغرضی کا سہارا لیتے ہیں اور ہر قسم کی جواب دہی سے روگردانی اختیار کر لیتے ہیں۔اسی مطلق العنانی کا دوسرا نام استبداد ہے۔فرعون اسی استبداد کا مجسمہ تھا۔دوسری طرف مذہبی پیشوائیت کا استبداد ہے جس کی گرفت انسانی ذہن پر ہوتی ہے اور ہامانؔ اسی استبداد کا مجسمہ تھا اور پھر سرمایہ داری کا استبداد ہے جو انسان کی اخلاقی جرأتوں کو پامال کرتا ہے۔قارون اسی استبداد کا مجسمہ تھا۔قرآن کریم میں داستان بنی اسرائیل میں فرعون، ہامان اور قارون کا ذکر دراصل تاریخ انسانی کے استبداد کی داستان ہے اور تاریخ انسانی میں جہاں جہاں استبداد نظر آئے گا وہ اس زمانے کے فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں کی وجہ سے ہو گا اور ان کے باہمی گٹھ جوڑ سے ہوگا۔

استبداد میں حکومت یا تو کسی قانون یا رائے عامہ کی پابند نہیں ہوتی یا ایک حد تک پابند تو ہوتی ہے مگر اختیار رکھتی ہے کہ جب چاہے اس پابندی کو دور کر دے۔جس طرح مطلق العنان بادشاہوں کی حکومتیں مستبد ہوتی ہیں اسی طرح ان بادشاہوں کی حکومتیں بھی مستبد ہوسکتی ہیں جن کے ہاں مجلسِ مشاورت تو موجود ہومگر وہ خود جواب دہی سے آزاد ہوں۔اسی طرح وہ حکومتیں بھی مستبد ہوسکتی ہیں جو نمائندہ یا غیرنمائندہ جماعتوں کے ہاتھ میں ہوتی ہیں کیونکہ مشاورت میں چندافراد کی شمولیت استبداد کا سد باب نہیں کرسکتی بلکہ بعض اوقات اس قسم کی حکومتیں شخصی حکومتوں سے بھی زیدہ جابر اور مضر ہوتی ہیں۔پاکستان کی سابقہ تاریخ آپ کے سامنے ہے۔نیز وہ حکومتیں بھی مستبد ہوسکتی ہیں جو عوام کی نمائندہ تو ہوں لیکن ان میں تنفیذی قوتیں قانونی قوتوں کے سامنے جواب دہ نہ ہوں اور جس میں عوام، حکمرانوں کا محاسبہ کرنے کا حق نہ رکھتے ہوں۔غرضیکہ کوئی حکومت استبداد سے مبرا نہیں ہوسکتی۔ جب تک اقتدار قانون کا نہ ہو اور وہ

قانون بھی خالصتہً انسانی ذہن کی پیداوار نہ ہو۔

استبداد کو مٹا کر اس کی جگہ عدل لانے کے لئے پہلے زندگی کی اقدار کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ یہی کلیدی نقطہ ہے۔ جیسی اقدار ویسی زندگی۔ اقدار کے بدلنے سے زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے۔ نگاہ کا زاویہ بدلنے سے داخلی انقلاب آتا ہے اور داخلی انقلاب کے بعد خارجی انقلاب کا آنا لازمی ہے۔ رسول اللہﷺ اس انقلاب کو (By Revolution) لائے تھے لیکن فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں نے پھر نگاہ کے زاویے بدل دیئے قرآن کی دی ہوئی روشنی چھپ نہیں سکتی اور اب وہ (By Evolution) اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی نمودار ہوتی چلی جارہی ہے۔ انسانیت اپنے ماحول سے مجبور ہو کر ان مستقل اقدار کی طرف بڑھ رہی ہے جو قرآن نے دی ہیں۔ انسانیت کا زاویہ نگاہ بہرصورت بدل کے رہے گا لیکن اگر کوئی موجودہ قوم یا حکمران یا چیف جسٹس ہی کائناتی قوتوں کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو جائے تو وہ انقلاب آج آ سکتا ہے جو دس بیس یا سو سال کے بعد آنے والا ہے۔ آج بھی اگر کوئی مردِ مومن میدان میں آ جائے تو اس کی ایک نگاہ سے تقدیریں بدل سکتی ہیں لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ''حکم'' اللہ کے قانون کا ہو جن کے ہاتھ میں اس قانون کا نفاذ ہو وہ اپنی بشریت کے تقاضوں کو قانون کے تقاضوں سے الگ رکھیں اور اپنا معیارِ زندگی ایک عام انسان کے معیارِ زندگی کی سطح پر لے آئیں۔ اس صورت میں پھر وہی عدل و مساوات کا دور واپس آ سکتا ہے جو صدرِ اول میں تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ بات انتہائی افسوسناک ہے کہ گزشتہ مالی سال میں پاکستان نے تعلیم اور صحت کی مد میں مختص کی گئی رقوم میں تاریخی کمی کی ہے اور 30 جون 2009ء کو ختم ہونے والے مالی سال میں یہ 1.1 اور 0.3 فیصد رہیں۔ وطن عزیز میں پچھلی کئی دہائیوں سے تعلیم اور صحت کی مد میں اتنے کم تناسب سے رقوم خرچ نہیں کی گئی تھیں 1990ء کی دہائی کو فوجی ڈکٹیٹر پرویز مشرف کے دور میں اسٹیٹ بینک نے بھی معیشت کے لحاظ سے ناکام دہائی قرار دی تھی مگر اس دہائی میں بھی تعلیم کی مد میں 2.3 فیصد اور صحت کی مد میں 0.7 فیصد رقوم خرچ کی گئی تھیں یہ امر یقیناً اس لئے بھی مزید تشویشناک ہے کہ مالی سال 2009ء میں مجموعی ملکی پیداوار کے تناسب سے تعلیم اور صحت کی مد میں پاکستان میں خرچ کی جانے والی یہ رقوم افریقہ کے بہت سے انتہائی غریب ملکوں کے مقابلے میں بھی انتہائی کم ہیں بلکہ حکومت کے شاہانہ اخراجات اور حکمرانوں کے سرکاری خرچ پر ٹھاٹھ باٹھ ان مالدار صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک کے حکمرانوں کے سرکاری اخراجات سے کہیں زیادہ ہیں جن سے ہم امداد اور قرضوں کے طلبگار رہتے ہیں۔ وطن عزیز کی معیشت روبہ زوال ہے اور ملک میں غربت، بے روزگاری تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ یہ امر نہایت افسوسناک ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر صفدر محمود

ہمیں کیا ہو گیا ہے؟

ماشاء اللہ ہمارے ملک میں جعل سازوں کی کمی نہیں اور اللہ کے فضل و کرم سے پاکستانیوں کی جعل سازی اور دھوکہ دہی کی داستانیں الف لیلوی کہانیوں کی مانند دنیا کے ہر گوشے میں مشہور ہیں۔ جعل سازی ہی کی ایک قسم ملاوٹ ہے اور گزشتہ طویل عرصے سے ملاوٹ پاکستان پر راج کر رہی ہے۔ دوائیوں سے لے کر کھانے پینے کی ہر شے تک ملاوٹ نے اپنا جال بچھا رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ ملاوٹ اور جعل سازی کا کاروبار سرکاری کارندوں کی ملی بھگت کے بغیر پروان نہیں چڑھ سکتا۔ میں نے جاری نہیں رہ سکتا ہے نہیں لکھا کیونکہ ہمارے ہاں یہ کاروبار جاری ہے اگلی منزل پر پہنچ کر دن رات پروان چڑھ رہا ہے۔ دوائیاں، کھانے پینے کی اشیاء خاص طور پر دودھ، آٹا، دالیں وغیرہ ملاوٹ کرنے والوں کا پسندیدہ ترین نشانہ ہیں کیونکہ یہ اشیاء سب سے زیادہ بکتی ہیں اور ہر انسان کی مجبوری ہوتی ہیں۔ گویا ہمارے منافع خور انسانوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کے ماہر ہیں۔ مولانا حضرات اس صورتحال کو خوف خدا کے فقدان کا نتیجہ کہیں گے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر انسان کا دل خوف خدا سے منور ہو تو وہ جعل سازی اور ملاوٹ کے ذریعے انسانی زندگیوں سے کھیل کر جہنم نہیں خریدے گا لیکن سوال یہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں جہاں لوگ خوف خدا میں مبتلا نہیں ہوتے وہاں ملاوٹ اور جعل سازی کیوں نہیں ہوتی۔ سیدھی سی بات ہے کہ وہاں سزا کا خوف اور قانون کی پکڑ انہیں ایسا نہیں کرنے دیتی اور انہیں اچھی طرح علم ہوتا ہے کہ پھر رشوت ان کی مدد نہیں کر سکے گی چنانچہ وہ خوف خدا کی بجائے خوف قانون کے سبب آسان اور سستا منافع کمانے سے پرہیز کرتے ہیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں نہ خوف خدا ہے اور نہ خوف قانون۔ چنانچہ لوٹ مار کرنے والوں یا قومی خزانہ لوٹنے والوں، انسانی زندگیوں سے کھیلنے والوں اور ہر قسم کے جعل سازوں کو کھلی چھٹی حاصل ہے۔ ماشاء اللہ ہمارے حکمران دن رات بڑے بڑے کاموں میں مصروف رہتے ہیں اس لئے انہیں چھوٹے کاموں کے لئے فرصت ہی نہیں ہے حالانکہ یہ

چھوٹے کام قوم کے ہر فرد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ پاکستان کے ہر شہر میں نمبر 2 دوائیں' مشینی پرزہ جات اور خورونوش کی اشیاء سرعام فروخت ہو رہی ہیں' حکومت موجود بھی ہے اور حکومت موجود نہیں بھی۔ چند روز قبل خبر آئی تھی کہ پانی بیچنے والی تین درجن کمپنیوں میں سے صرف تین رجسٹرڈ ہیں اور بہت سی صحت مند پانی والی کمپنیاں عام نلکوں کا پانی خوبصورت بوتلوں میں پیک کر کے شہریوں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈال رہی ہیں۔ میں یہ خبر پڑھ کر منافع کمانے والے جعل سازوں اور حکومت کی حسن کارکردگی پر عش عش کر اٹھا۔ خبر چھپنے کے باوجود غیر رجسٹرڈ شدہ کمپنیوں کا پانی بدستور مارکیٹ میں دستیاب ہے اور حکومتی مشینری کا منہ چڑا رہا ہے۔ نمبر 2 یا جعلی دوائیوں کا کاروبار عام طور پر ہسپتالوں کے اردگرد فروغ پا رہا ہے اور ان گنت لوگ صرف جعلی دوائیوں کے سبب جہان فانی سے رخصت ہو رہے ہیں لیکن حکومت کے اہلکار رشوت لے کر اس صنعت کو تحفظ دینے میں مصروف ہیں۔

کس کس بات کا رونا رویا جائے کیونکہ ہمارے ہاں تو آوے کا آوہ ہی بگڑ چکا ہے اور قومی زندگی کے جس شعبے پر بھی انگلی رکھی جائے خون بہنے لگتا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ محترم غلام احمد پرویز (معروف مذہبی سکالر) کہا کرتے تھے کہ اس دور میں تو مجنوں کی محبت بھی خالص نہیں رہی اور اب تو عاشق بھی محبوبہ کو خط لکھ کر کہتا ہے کہ میں تمہارے لئے جان دے سکتا ہوں' میں تمہارے لئے پہاڑ کھود سکتا ہوں اور میں تمہیں کل باغ جناح میں ملوں گا اگر مطلع ابر آلود نہ ہوا تو.....!! میں غلام احمد پرویز صاحب سے کبھی نہیں ملا لیکن ان کے خطبے کے یہ فقرے مجھے اکثر یاد آتے ہیں اور موجودہ دور کی ہر نمبر 2 شے کی جانب توجہ دلاتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم نمبر 2 عہد میں زندہ ہیں جہاں ماں کی محبت اور دعا کے علاوہ کوئی بھی خالص اور اصلی شے موجود نہیں' انسانی تعلقات مفاد پرستی کا شاہکار بن چکے ہیں' رشوت کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا' جھوٹ اور مکروفریب کاروباری دنیا سے لے کر سیاست اور عام زندگی تک ہماری اتنی پختہ عادت بن چکے ہیں کہ لوگ اس بے لذت گناہ کا ارتکاب کرتے ہوئے لمحے بھر کے لئے شرمندہ نہیں ہوتے۔ یقین کیجئے کہ اب اگر کوئی شخص بھولے سے سچ بول جائے یا وعدہ ایفا کر دے تو خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا والی کیفیت ہوتی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ تھا سود کھا کر خدا کے خلاف جنگ کرنے کے باوجود' دن رات جھوٹ بیچ کر دولت کے انبار لگانے کے باوجود' ملاوٹ کر کے انسانی زندگیوں سے کھیلنے کے باوجود ہم خدا کے فضل کی توقع کرتے ہیں اور دعائیں مانگتے ہیں۔ کس قدر سادہ لوح ہیں ہم لوگ؟ ایک زمانہ تھا کہ سیاست کو لوگ خدمت اور عبادت کہتے تھے لیکن ماشاء اللہ ہمارے لیڈروں کے کارناموں نے اس تصور کو ہی بدل دیا۔ اب سیاست نام ہے لوٹ مار'

قانون شکنی اور دھونس دھاندلی کا۔ کسی زمانے میں حاجی حضرات کو نیکی اور شرافت کا نمونہ سمجھا جاتا تھا اور خیال کیا جاتا تھا کہ انسان حج کر کے دل کو دنیاوی بتوں' حرس و ہوس اور جھوٹ سے پاک کر لیتا ہے' اپنے گناہوں کی معافی مانگ کر گناہوں سے تائب ہو جاتا ہے لیکن اب تو یہ عالم ہے کہ لوگ برملا کہتے پھرتے ہیں عام آدمی کے ڈنگ مارنے سے انسان بچ بھی سکتا ہے لیکن حاجی کا ڈسا ہوا بچ نہیں سکتا۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے عام پاکستانی کی دھوکہ دہی سے دوگنا صدمہ اس وقت ہوتا ہے جب جعل ساز کے نام کے ساتھ حاجی بھی لکھا ہوا ہو۔ گزشتہ دنوں ہمارے ایک نامور مذہبی سکالر ایک نجی محفل میں نصیحت کر رہے تھے کہ کسی مذہبی شخصیت سے لین دین کرتے ہوئے دوگنا احتیاط کیا کریں۔ کس قدر افسوس اور دکھ کا یہ مقام ہے جس نے نیکی' عبادت اور مذہب کے تصور کو ہی یکسر بدل دیا ہے۔ ترقی یافتہ جمہوری ممالک میں منتخب اراکین اسمبلی کو معاشرے کا رول ماڈل سمجھا جاتا ہے اور ان سے ذرہ بھر بھی فروگزاشت ہو تو آسمان سر پر اٹھا لیا جاتا ہے لیکن ہمارے ہاں سیاست بھی گالی بن چکی ہے۔ حکمرانوں کی لوٹ مار اور کرپشن کی کہانیاں بالواسطہ طور پر کرپٹ عناصر کی حوصلہ افزائی کا باعث بن رہی ہیں۔ اسی لئے تو وہ کہاوت بنی ہے کہ اگر بادشاہ باغ سے ایک سیب اتار لے تو فوج سارے باغ کو اجاڑ دیتی ہے۔ چنانچہ آج کل ہم باغ کی اسی ویرانی کا منظر دیکھ رہے ہیں۔

سیاست کے رول ماڈلوں یعنی معاشرے کے اعلیٰ نمونوں کا یہ حال ہے کہ مسلم لیگ (ن) اصول کی سیاست پر فخر کرتی ہے لیکن اس اصولی سیاست کے نیچے جعل سازی کے ایسے نمونے بھی دریافت ہوئے ہیں جنہوں نے مسلم لیگ (ن) کا دامن داغدار کر دیا ہے یہ مسلم لیگ (ن) کی قیادت کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ اگرچہ قوم کو ان بدنام اور کاریگر عناصر پر بھی اعتراض ہے جنہوں نے مسلم لیگ (ن) کی قیادت کے اردگرد خوشامد کا جال بن رکھا ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ صرف دو سال کے اندر اندر مسلم لیگ (ن) کی صفوں میں اتنے جعل ساز کیوں کر دریافت ہوئے ہیں؟ کیا مسلم لیگی قیادت جسے قائداعظم کی میراث پر فخر ہے آنکھیں بند کر کے اسمبلیوں کے ٹکٹ ''فروخت'' کر رہی تھی یا وہ اعلیٰ اقدار پر یقین نہیں رکھتی۔ گزشتہ سال مسلم لیگ (ن) کے ایم۔این۔اے حاجی پرویز..... میرا زور حاجی پر ہے..... اپنے بھانجے کو امتحانی مرکز میں بٹھا کر اپنے پرچے حل کرواتے ہوئے پکڑے گئے۔ ظاہر ہے کہ ان کا مقصد جعلی ڈگریاں حاصل کر کے وزارت کا خواب دیکھنا تھا اور نہ جانے وہ وزیر بن کر کیا گل کھلاتے۔ پھر مسلم لیگ (ن) کے ایک رکن اسمبلی پر زنا کا الزام لگا اور برسرعام لگا لیکن اس پر پردہ ڈال دیا گیا۔ اسی جماعت کی ایک خاتون رکن چوری میں ملوث پائی گئیں اور

میڈیا نے ان کی کارکردگی ٹی وی پر دکھا دی۔ آج کی تازہ خبر کے مطابق الیکشن ٹربیونل نے مسلم لیگ (ن) کے ایم۔پی۔اے حاجی ناصر محمود کو جعلی ڈگری کی بناء پر نااہل قرار دے دیا ہے۔ ماشاءاللہ اول تو ناصر صاحب حاجی ہیں اور دوم ''قائداعظم'' کی جماعت مسلم لیگ (ن) کے رکن ہیں۔ اللہ اللہ خیر سّلا۔ میں نے عرض کیا ناں کہ مجھے ایک عام شہری کی جعل سازی پر دکھ ہوتا ہے لیکن حاجی صاحب کی دھوکہ دہی پر دوگنا صدمہ ہوتا ہے۔

یارو ذرا سوچو ہمیں کیا ہو گیا ہے؟ یہ مکر و فریب' جھوٹ' جعل سازی' ملاوٹ' رشوت' کرپشن ہمیں کہاں لے جائے گی؟ ہم اتنے تہی دامن اور داغدار تو کبھی بھی نہ تھے۔ ہے کوئی مرد قلندر جو اٹھے اور اس طوفان بلا کے سامنے بند باندھنے کی کوشش کرے۔ میں اسی صبح نو کے لئے دعا گو ہوں اور اس سحر کا منتظر ہوں۔

سانحۂ ہائے ارتحال

بزم طلوع اسلام کوئٹہ کے نمائندہ محترم قدیر احمد خان کی اہلیہ محترمہ گذشتہ دنوں وفات پا گئیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا کرے اور پس ماندگان کو صبر کی توفیق سے نوازے۔ادارہ قدیر احمد خان صاحب اور مرحومہ کے دیگر اعزہ واقرباء کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

☆☆☆

سابقہ نمائندہ بزمِ طلوع اسلام لندن محترمہ روبینہ خواجہ کی والدہ محترمہ گذشتہ ماہ انتقال فرما گئیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنت عطا کرے۔ادارہ مرحومہ کے اعزہ واقرباء کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

☆☆☆

محمد علی صابر صدیقی صاحب کے صاحبزادے وقار صدر صدیقی 13 دسمبر 2009ء کو لاس اینجلس' امریکہ میں بقضائے الٰہی وفات پا گئے ہیں۔ مرحوم نے ایک بیوہ اور دو کم سن بچیاں سوگوار چھوڑی ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے آمین۔ادارہ مرحوم کے اعزہ واقرباء کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

(ادارہ طلوع اسلام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

بدلتی تاریخ

ہم مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں سے ایک سبب تاریخی تقدس Sanctity بھی ہے۔ ہمارے ہاں تاریخ تقریباً تیسری صدی ہجری سے منضبط ہونا شروع ہوئی جن حضرات نے تاریخ لکھنی شروع کی ان کی قابلیت کے لئے جو تحریر کرنا مقصود ہے اس کے لئے انگریزی الفاظ زیادہ موزوں ہیں کہ وہ حضرات Professional Sense میں Historians نہیں تھے اور وہ ایک Historian کی Requirements پوری نہیں کرتے تھے۔ وہ صرف وقائع نویس Chronicle Writers تھے۔ ان کے سامنے تاریخ نویسی کے کوئی اصول نہیں تھے۔ صحیح معنوں میں انہیں Historian نہیں کہا جا سکتا۔ انہوں نے واقعات صرف اس وجہ سے Preserve کر لئے تھے تاکہ وہ اگلی نسلوں تک منتقل ہوتے جائیں۔ ان نوشتوں میں بہت زیادہ باتیں متضاد بھی ہیں۔ ان کا اپنا عندیہ بھی یہ نہیں تھا کہ تاریخ کو کسی قسم کا تقدس دیا جائے، اور اسے Sacred Cow بنا دیا جائے۔ لیکن ہمارے لئے یہ تاریخ قرآن فہمی میں ایک رکاوٹ بن کر کھڑی ہوگئی ہے۔ جب وہ واقعات سامنے آتے ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں تو ہماری پیشوائیت ہمیشہ تاریخ کو اولین ترجیح دیتی ہے اور قرآن فہمی میں رکاوٹ بنتی ہے۔ اس بارے میں بے شمار مثالیں ہیں لیکن چند مثالیں پیش خدمت عالی کی جاتی ہیں۔

سب سے پہلے تحریک طلوع اسلام نے یہ مسئلہ اٹھایا کہ قرآن کی رو سے بلوغت، نکاح کے لئے ایک شرط ہے۔ (4:6) قرآن کریم کی یہ بات اتنی واضح تھی کہ ہمارے علماء کرام اس کی تردید نہیں کر سکتے تھے تو انہوں نے اس شرط سے انکار کرنے کے لئے قرآن سے کوئی سند نہیں دی بلکہ انہوں نے تاریخ کا سہارا لیا کہ چونکہ حضرت عائشہؓ کا نکاح قبل از بلوغت ہوگیا تھا، اس لئے بلوغت نکاح کے لئے شرط نہیں ہے۔ بلکہ بعض مرتبہ عدالتوں میں بھی ان کی کمسنی کو بطور دلیل پیش کیا جاتا تھا۔ اور اس طرح یہ تاریخی واقعہ قرآن فہمی میں ایک روک بنا۔ لیکن چونکہ نابالغ کے

نکاح کی اجازت قرآن میں نہیں ہے اور عقل عامہ اور موجودہ دور کی ضروریات بھی اس کے خلاف جاتی ہیں اس لئے مولوی حضرات بھی یہ چاہتے تھے کہ یہ ثابت ہو جائے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر بلوغت کو پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ تحریک طلوع اسلام کے زیر اثر انہوں نے بھی اس بات کا اعتراف کر لیا۔ مشہور و معروف عالم دین جناب مولانا عمر احمد عثمانی نے فقہ القرآن نام کی ایک کتاب دس جلدوں میں تصنیف فرمائی ہے۔ یہ کتاب فقہ کی دنیا میں ایک منفرد مقام کی حامل ہے۔ وہ اس کتاب میں حضرت عائشہؓ کی عمر کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ: ''اس سلسلہ میں (یعنی حضرت عائشہؓ کی عمر کے بارے میں) بڑی اہم اور مسرور کن خبر یہ ہے کہ حال ہی میں جناب مولانا حکیم نیاز احمد صاحب اور مولانا الیف اللہ صاحب عثمانی پانی پتی' سرگودھا' فاضل دیوبند اور مولانا عظمت اللہ صاحب فاضل دیوبند' کی مشترکہ کوششوں سے ایک نہایت مہتم بالشان کتاب سامنے آئی ہے' یہ حضرات شیخ الاسلام سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ' کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ ان کی کتاب کا نام ''کشف الغمہ عن عمر الامہ'' ہے۔ کتاب بڑی تقطیع کے چھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کتاب میں ان حضرات نے ان تمام روایات کا استیعاب کر کے' جن سے حضرت عائشہؓ صدیقہ کی صِغر سِنی پر استدلال کیا جاتا تھا' محدثین کے اصول پر تنقید فرمائی اور ایک ایک راوی کے متعلق اسماء الرجال کی کتابوں سے پوسٹ مارٹم کر کے ثابت فرمایا ہے کہ 143 ہجری تک بخاری شریف کی ہشام بن عروہ والی ''حدیث'' کا کوئی وجود ہی نہیں تھا' جو اس سلسلہ میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے' اور جو متعدد سندوں سے صحیح بخاری میں جگہ پا گئی ہے۔'' اس سے آگے اسی کتاب فقہ القرآن میں مولانا عمر احمد عثمانی صاحب' اس کتاب کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ: ''مولانا حکیم نیاز احمد صاحب اپنے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں'' پہلے خیال تھا کہ اسے شائع نہ کیا جائے کیونکہ اس سے احادیث کی صحت پر حرف آئے گا' اور منکرین حدیث کو تقویت ملے گی۔ مختلف علماء سے تبادلۂ خیال کیا گیا' اکثر کی رائے یہی تھی (کہ اس کو شائع نہ کریں۔ راقم سطور) لہٰذا کتاب کے مسودے میں بار بار ترمیم کرنی پڑی''۔ آپ غور فرما رہے ہیں کہ قرآن کریم کے ایک واضح حکم کو کس طرح تاریخ پر منحصر کیا جا رہا ہے۔ جب طلوع اسلام نے حضرت عائشہؓ کی عمر نکاح کے وقت انیس سال ثابت کی تھی تو انہوں نے اس کو Appreciate نہیں کیا تھا' بلکہ خود اس کی تحقیق کی اور اس طرح یہ تاریخی رکاوٹ دور ہو گئی۔

دوسری نمایاں مثال صحابۂ کرام کے آپس میں جنگ و جدال کی ہے۔ تاریخ میں ہے کہ جنگ جمل اور جنگ صفین میں ستر ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ جنگ جمل میں ہی حضرت علیؓ نے حضرت زبیر بن العوام کو قتل کیا۔ یہ حضرت

زبیر کبار صحابہ میں سے تھے۔حضورﷺ کے اور حضرت علیؓ کی حقیقی پھوپھی حضرت صفیہؓ کے بیٹے تھے۔یعنی حضرت علیؓ کے First Cousin تھے اور دونوں ماشاءاللہ رضی اللہ عنہٗ ہیں اور دونوں ''عشرہ مبشرہ'' میں شامل ہیں۔قرآن کی رو سے صحابہ کرامؓ آپس میں نہیں لڑ سکتے تھے۔ (19:96, 48:29) لیکن چونکہ یہ تاریخ میں تحریر ہے' اس لئے ہمارے علماء کرام' قرآن کی واضح تعلیم کے خلاف' ان جنگوں کے قائل ہیں۔ اور اس طرح اسلام کی بھیانک تاریخ پیش کرتے ہیں۔

بنوعباس کے دور میں جب کوئی بادشاہ فوت ہوتا تھا تو وہ اپنی وفات سے کچھ پیشتر اپنے بیٹوں میں سے کسی کو اپنا جانشین بنا دیتا تھا' یا ان کے درمیان مملکت کو تقسیم کر جاتا تھا۔لیکن بادشاہ کے مرنے کے بعد' ہمیشہ اس کے بیٹوں میں جنگیں ہوئیں' اور خون خرابہ ہوا۔ اس دور کے عوام بادشاہوں اور شہزادوں کو اس کشت وخون کا ذمہ دار ٹھہراتے تھے اور اس کو کراہت کی نظر سے دیکھتے تھے۔اس کراہت سے بچنے کے لئے اس دور کے تاریخ نویس حضرات نے ان واقعات کو جنم دیا کہ جب حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ اقتدار کی خاطر لڑ سکتے تھے' تو ان شہزادوں کا اس میں کیا قصور ہے' اور اس طرح ان شہزادوں کے ضمیر کو مطمئن کر دیا گیا اور عوام کی تنقید بھی ختم ہوگئی۔

اسی طرح قرآن کریم نے غلامی کو بالکل بند کر دیا تھا (24:33, 47:4) لیکن ان واضح آیات کے بعد بھی آپ دیکھیں گے کہ تاریخ میں بے شمار جگہ پر درج ہے کہ صحابہ کرامؓ اور اس کے بعد' بڑے بڑے علماء کے پاس غلام اور لونڈیاں تھیں اور بادشاہوں کے حرم میں بھی کنیزیں تھیں۔اب جب بھی غلاموں اور لونڈیوں کے خلاف آواز اٹھائی جاتی ہے ہمارے علماء ان تاریخی یادداشتوں کو سند کے طور پر پیش کر دیتے ہیں۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت سلمان فارسی محض فرضی شخصیت ہیں۔ایران والوں نے ایران کے تمام فضائل ان کے منہ سے نکلوائے ہیں۔اسی طرح ان کے بقول حضرت عباسؓ فرضی شخصیت ہیں۔ عباسی خلفاء نے حضورﷺ سے اپنی رشتہ داری ثابت کرنے کے لئے یہ شخصیت وضع کی ہے۔

یہ سب تمہید اس لئے تحریر کی گئی ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ تاریخ کس طرح قرآن فہمی میں رکاوٹ بنتی ہے۔ اب یہ عرض کیا جائے گا کہ تاریخ بنتی کیسے ہے' ملاحظہ فرمائیں۔

پاکستان ماضی قریب میں بنا ہے۔اب بھی وہ حضرات زندہ ہیں جنہوں نے خود اپنی آنکھوں سے پاکستان بنتا دیکھا ہے۔ وہ حضرات بھی ہیں جنہوں نے اس کی تشکیل میں عملاً حصہ لیا ہے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ پاکستان کے قیام کی مخالفت میں ہماری پیشوائیت نے ڈٹ کے

مقابلہ کیا ہے۔اس وقت علماء کرام کی نمائندہ جماعت جمیعت العلماء ہند تھی جس کے صدر جناب مولانا حسین احمد مدنی صاحب تھے اور تمام علماء کرام اسی جمیعت سے منسلک تھے اور قیام پاکستان کے سخت مخالف تھے۔آپ حضرات کو یاد ہوگا کہ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مرحوم نے بھی اس بات کا اعتراف فرمایا کہ جب انہوں نے کہا تھا کہ وہ پاکستان بنانے کے گناہ میں شریک نہیں تھے۔ ان تمام واقعات کے علی الرغم آپ ملاحظہ فرمائیں کہ آٹھویں جماعت کے بچوں کے لئے ایک درسی کتاب ہے جس کا نام ''اردو کی آٹھویں کتاب'' ہے۔ یہ سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ' جام شورو' سندھ' نے طبع کرائی ہے۔اس کتاب میں چالیس اسباق ہیں۔ ان اسباق میں سے ایک سبق کا عنوان ''تحریک پاکستان میں علماء کا حصہ'' ہے۔ یہ سبق محاکاتی انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ بچے اپنے دادا جان سے تشکیل پاکستان کے متعلق سوال کرتے ہیں اور ان کے دادا جان ان سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔اگرچہ مناسب تو یہ تھا کہ یہ پورا سبق آپ کی خدمت عالی میں پیش کیا جاتا' لیکن اس سے مضمون کے طویل ہونے کا اندیشہ ہے۔اس کا ایک حصہ اس کتاب سے نقل کیا جاتا ہے۔ملاحظہ فرمائیں۔

مشاہد: دادا جان' مسلمانوں کے ساتھ انگریز حکومت کا طرزِ عمل کیسا رہا؟

دادا جان: جنگ آزادی میں ناکام ہونے کے بعد عام مسلمانوں اور علماء کو انگریز حکومت نے سختی کے ساتھ کچلنے کی کوشش کی تھی۔ انہیں برسرعام پھانسیاں دی گئیں' جلاوطن کیا گیا' بہت سے لوگوں کو ''کالا پانی'' بھیج دیا گیا۔

اشرف: تو پھر مسلمانوں نے اس کے لئے عملی طور پر کس قسم کی جدوجہد کی؟

دادا جان: مسلمانوں نے مجلس خلافت' تشکیل دی جو اس وقت مسلمانوں کی سب سے زیادہ موثر اور فعال جماعت تھی۔تمام قابل ذکر علماء اس جدوجہد میں پوری طرح شامل تھے۔مسلمانوں میں اپنے قومی وجود کی بقاء کا مسئلہ زیادہ اہمیت اختیار کر گیا انہیں ایک علیحدہ وطن کی ضرورت محسوس ہوئی۔

اشرف: دادا جان۔جن علماء نے تحریک پاکستان کی اس جدوجہد میں حصہ لیا ان میں خاص خاص کون تھے؟

دادا جان: دیکھو بھئی ویسے تو اس تحریک میں بہت سے علماء شامل تھے۔لیکن ہم تمہیں صرف چند کے بارے میں بتاتے چلیں۔مولانا اشرف علی تھانوی' مولانا شبیر احمد عثمانی' مولانا ظفر احمد عثمانی' مفتی محمد شفیع' پیر محمد حسن جان مجددی سرہندی' مولانا عبدالعلیم صدیقی' علامہ سعید احمد کاظمی' مولانا عبدالحامد بدایونی' مولانا عبدالماجد بدایونی' پیر

غلام محمد مجددی سرہندی، پیر مانکی شریف، پیر ذکوڑی شریف اور حافظ کفایت حسین بہت با اثر اور ممتاز تھے۔ ان علماء کی وجہ سے پورے برصغیر میں علماء کا تعاون مسلم لیگ کو حاصل ہوا۔ اس وقت تحریک پاکستان کو عام کرنے کے لئے ایک تنظیم ''جمعیت علماء اسلام'' بھی تشکیل دی گئی جس کی علمی کوششوں کی بدولت نظریۂ پاکستان زیادہ وضاحت سے سامنے آیا۔ چنانچہ عام مسلمان اور علماء کی ایک بڑی تعداد کانگریس کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شریک ہونے لگی، اس سے تحریک پاکستان کو بڑی تقویت پہنچی۔

نومی: دادا جان۔ ان میں سے چند علماء کے بارے میں ہمیں الگ الگ مختصر طور پر کچھ بتائیے۔

دادا جان: اچھا تو سنو۔ مولانا اشرف علی تھانوی کی خواہش تھی کہ زمین کے ایک حصہ پر خالص اسلامی حکومت قائم کی جائے، ایسی حکومت جس کے تمام قوانین شریعت کے مطابق ہوں۔ عدالتیں بھی شرعی ہوں۔ بیت المال اور زکوٰۃ کا نظام رائج ہو۔ ان کا خیال تھا کہ غیر مسلم قوموں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے یہ اسلامی مقاصد پورے نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے مسلمانوں کے آئینی اور دینی مفادات کے تحفظ کے لئے کوششیں کیں۔ مسلمانوں کے دستوری معاملات کا شریعت کے مطابق فیصلہ کرانے کے لئے عدالتوں میں قاضیوں کے تقرر کی تحریک بھی سب سے پہلے انہوں نے شروع کی۔ انہوں نے مجلس ''دعوت الحق'' بھی قائم کی، جس کا مقصد دین اسلام کے مطابق مسلم لیگ کے لئے راہ عمل تجویز کرنا اور اصلاح کرنا تھا۔ وہ پاکستان کے وجود کو مسلمانوں کی بقا اور حیات قومی کے لئے لازمی سمجھتے تھے۔

شاہد: دادا جان اب کچھ مولانا شبیر احمد عثانی کے بارے میں بھی بتائیے۔

دادا جان: مولانا شبیر احمد عثانی بھی نظریۂ پاکستان کے قائل تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہندو اور مسلم دو الگ قومیتیں ہیں۔ وہ ساتھ مل کر نہیں رہ سکتیں۔ اسی لئے انہوں نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ انہوں نے ان علماء کو متحد کیا جو دو قومی نظریئے کے قائل تھے، انہوں نے ''جمعیت العلماء اسلام'' بھی تشکیل دی۔ قائداعظمؒ کے کہنے پر انہوں نے صوبہ سرحد کا دورہ کیا اور رائے عامہ کو پاکستان کے حق میں ہموار کیا۔

اشرف: دادا جان۔ تحریک پاکستان میں مولانا ظفر احمد عثانی نے کیا حصہ لیا؟

دادا جان: بھئی۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے

سیاسی سطح پر تبلیغ و اصلاح کی جو مجلس تشکیل دی تھی مولانا ظفر احمد عثمانی اس کے اہم رکن تھے اور تقریباً تمام اہم وفود میں شریک رہے' مسلم لیگ کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے وہ بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔ پاکستان بنانے کے سلسلے میں جو فیصلہ کن انتخابات ہونے والے تھے ان کے لئے چار ماہ تک انہوں نے مختلف علاقوں کا دورہ کیا اور رائے عامہ کو پاکستان کے حق میں ہموار کیا۔

نومی: اس تمام جدوجہد میں مولانا شفیع کس حد تک شریک رہے؟

داداجان: مولانا محمد شفیع نے بھی دوقومی نظریے کی وجہ سے کانگریس سے علیحدگی اختیار کی تھی' انہوں نے اپنی تحریروں سے پاکستان کے مطالبے کی وضاحت کی۔تحریک پاکستان کی مقبولیت کے لئے انہوں نے ہندوستان کے مختلف حصوں بالخصوص صوبۂ سرحد کا دورہ کیا۔ یہ ان کی تبلیغی کوششوں ہی کا اثر تھا کہ وہاں لوگ مسلم لیگ کی حمایت کرنے لگے۔

بچو: یہ ایسے ہی علماء کی مستقل عملی اور تحریری کوششوں کا نتیجہ تھا کہ عوام میں مسلم لیگ نے زیادہ تیزی سے مقبولیت حاصل کی۔ مسلمانوں میں اپنے قومی تشخص کا احساس بیدار ہوا۔ انہیں ایک ایسا وطن حاصل کرنے کی لگن ہوئی جس میں وہ اپنے مذہب کے مطابق حکومت قائم کرسکیں۔'' (اقتباس ختم ہوا)۔

آپ نے اقتباس ملاحظہ فرمایا۔ اس کی طوالت کی وجہ سے میں معذرت خواہ ہوں۔ اس کا آخری پیراگراف خاص توجہ کا متقاضی ہے۔ جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ پاکستان صرف ہمارے علماء کرام نے ہی بنایا تھا۔

سارے مضمون میں صرف ایک مرتبہ قائداعظمؒ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ لیگ کے کسی مفتی کفایت اللہ' مولانا احمد سعید' جمعیت العلماء ہند' جماعت اسلامی' مجلس احرار' جمعیت الانصار اور دیگر مذہبی جماعتیں' جنہوں نے قیام پاکستان کی سخت مخالفت کی تھی' ان کا سرے سے کوئی تذکرہ نہیں۔ اس مضمون سے بچوں کے دماغ میں یہی بات پیوست ہوگی کہ پاکستان صرف علماء کرام نے بنایا تھا۔

دارالعلوم دیوبند پاکستان کے قیام کا مخالف تھا جبکہ علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء نے تعطیل کے دوران شہر شہر' قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں جا کر پاکستان کے قیام کے لئے راہ ہموار کی تھی۔ علماء کرام کو جب بھی پاکستان کے فوائد گنوائے جاتے اور اس کے قیام کے لئے مشورہ دیا جاتا وہ ہمیشہ متحدہ ہندوستان میں رہنے کی ہی تائید کرتے اور اسی بات کا مشورہ دیتے کہ متحدہ ہندوستان میں رہنا زیادہ فائدہ مند ہوگا۔

ڈوبنے والوں کو جب میں نے دیا ساحل سے ہاتھ
وہ مجھے بھی ڈوبنے کا مشورہ دینے لگے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

قرآن کے سانچے میں ڈھلا ہوا اِنسان

اصلاً یہ آغا شورش کاشمیری مرحوم کی ایک تقریر کے مختصرات ہیں' انہوں نے یہ تقریر آج سے کئی سال پہلے مولانا غلام مرشد سابق خطیب شاہی مسجد لاہور کے زیرِ صدارت بھاٹی دروازہ کے ایک جلسہ عام میں کی تھی۔(ادارہ)

خلافت راشدہ کا عہد اور نظام' اسلام کے تصورِ ریاست کا بہترین نمونہ تھے' اور حضرت عمرؓ اس ریاست کے اظہار کی مثالی شخصیت۔ ساڑھے تیرہ سو برس ہو چکے ہیں لیکن اس حقیقت ثابتہ سے انکار نہیں ہوسکتا کہ حضرت عمرؓ ہی اسلام کے تصور فرمانروائی کا حقیقی مظہر تھے۔ ان کے عہد سعادت گستر میں اسلام نے جو فتوحات حاصل کیں اور رسول اللہ ﷺ نے جس معاشرہ کی بنا رکھی' اس معاشرہ کو جو عروج و اقبال حاصل ہوا' اپنے نتائج و مضمرات اور آثار و مقدمات کے لحاظ سے آج تک اس کی نظیر نہیں ہے۔ حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے آپؓ کی خواہش کی تھی۔ مسلمانوں کو آپؓ کے قبول اسلام سے جو طاقت حاصل ہوئی' وہ اظہر من الشمس ہے' پہلا موقعہ تھا کہ کعبۃ اللہ کی چھت پر اذان دی گئی اور مسلمانوں نے باجماعت نماز ادا کی۔

آپؓ کا زمانہ خلافت دس برس چھ مہینے اور چار دن رہا۔فتوحات کے اعتبار سے یہ سارا عہد محیرالعقول ہے ممالک محروسہ کا رقبہ ساڑھے بائیس لاکھ مربع میل سے بھی اوپر ہوگیا۔ جہاں تہاں مسلمانوں کا لشکر پہنچا' اس کی چھاپ گہری سے گہری ہوتی گئی۔حتیٰ کہ آپؓ کا دورِ خلافت اپنے آثار و نتائج کی ایک ایسی داستان ہے کہ اسلام کسی حالت میں بھی اپنے فخر و ناز کی اس پونجی سے دستبردار نہیں ہوسکتا۔ کئی یورپی مصنفوں نے ان عالمگیر فتوحات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''عمرؓ چند سال اور زندہ رہتے تو دو تہائی کرۂ ارضی مسلمانوں کے زیرنگیں ہوتا۔ جہاں کہیں اسلام پہنچا۔ تمام آبادیاں مسلمان ہوگئیں' اس وقت کی مہذب دنیا کو

اسلام کے آستانہ پر جھکنے کے سوا چارہ کار ہی نہ تھا۔''

آپ کی شہادت محرم کی پہلی کو ہوئی' ہفتہ کا دن تھا' تین دن پہلے 26 ذی الحجہ کو مسجد میں نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہوئے' فیروز نام کے ایک پارسی غلام نے گھات میں سے نکل کر چھ وار کئے۔ ایک ناف کے نیچے پڑا' آپؓ نے عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اپنی جگہ کھڑا کر دیا اور خود زخم کی تاب نہ لا کر گر پڑے' اپنے بیٹے سے کہا: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ہاں جاؤ اور ان سے کہو' عمر حضورﷺ کے پہلو میں دفن ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا: میں نے یہ جگہ اپنے لئے رکھی تھی' اب عمرؓ چاہتے ہیں تو انہیں اجازت ہے' نماز جنازہ صہیب رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔ حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ حضرت عبدالرحمٰنؓ حضرت طلحہؓ سعد بن وقاص اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے قبر میں اتارا۔

اسلام کے اس سب سے بڑے حکمران کے ذمہ رحلت کے بعد چھیاسی ہزار کا قرض تھا۔ جو ان کا مسکونہ مکان بیچ کر ادا کیا گیا۔ امیر معاویہؓ نے یہ مکان خریدا' باب اسلام اور باب الرحمت کے درمیان واقع تھا مدتوں دارالقضا کے نام سے مشہور رہا' یہ اس خلیفہ راشد کا حال تھا' جس نے بادشاہوں کے خزانے عربوں کے پاؤں میں ڈھیر کر دیئے تھے اور جس کی سلطنت دور دراز تک چلی گئی تھی' بیت المقدس جو ان دنوں اسرائیل کے قبضہ میں ہے' اس کی فتح آپؓ ہی کے ہاتھوں مکمل ہوئی' اثنائے سفر میں شام سے قریب عمال و حکام کی ایک جماعت کو دیبا و حریر میں دیکھا تو غصہ میں آ گئے گھوڑے سے اتر گئے' ان کی طرف پتھر پھینکے' فرمایا: اتنی جلدی تم نے عجمی عادتیں اختیار کر لی ہیں' جس گھوڑے پر بیت المقدس گئے تھے' اس کے سم گھس کر بیکار ہو گئے۔ لوگوں نے ترکی گھوڑا پیش کیا' سوار ہو گئے' گھوڑا اُلیل کرنے لگا' فرمایا کم بخت یہ غرور کی چال تو نے کہاں سے سیکھی ہے؟ وہیں اُتر پڑے اور پیدل چل کر بیت المقدس میں داخل ہوئے' اس معمولی لباس میں تھے کہ مسلمان اپنے طور پر پریشان تھے کہ عیسائی کیا کہیں گے؟ لوگوں نے قیمتی پوشاک اور ترکی گھوڑا پیش کیا' فرمایا:

(خدا نے ہم کو جو عزت دی ہے' وہ اسلام کی عزت ہے اور ہمارے لئے یہی بس ہے۔)

بیت المقدس میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے مسجد اقصیٰ * میں گئے۔ حضرت بلالؓ سے کہا' اذان دیں' بلالؓ نے کہا میں فیصلہ کر چکا تھا کہ رسول اللہﷺ کے بعد کسی

* مسجد اقصیٰ سے مراد مدینہ ہے نہ کہ بیت المقدس کی کوئی مسجد۔ حضرت عمرؓ نے ہیکل سلیمانی کے کھنڈروں کے قریب ایک کھلی جگہ نماز پڑھائی اور نماز کے وقت اپنا رخ بیت المقدس کی طرف نہیں بلکہ کعبہ کی طرف کیا۔ جس کھلی جگہ پر حضرت بلالؓ نے اذان دی اور حضرت عمرؓ نے نماز پڑھائی تھی وہاں عبدالملک بن مروان نے مسجد تعمیر کرادی جسے مسجد اقصیٰ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں بیان کردہ مسجد اقصیٰ سے مراد عبدالملک کی تعمیر کردہ مسجد نہیں بلکہ مدینہ کا اسلامی مرکز ہے۔ (شاہکار رسالت۔ پرویزؒ)

فلسطین کی مسجد اقصیٰ کو اموی خلیفہ عبدالملک نے تعمیر کرانا شروع کیا جو اپنے بیٹے ولید کے زمانہ میں تکمیل کو پہنچی۔

اور کے لئے اذان نہ دوں گا' آپؓ کا ارشاد سر آنکھوں پر اذان شروع کی تو حاضر صحابہؓ کو رسول اللہ ﷺ کا زمانہ یاد آ گیا' سب پر رقت طاری ہوگئی' ابوعبیدہؓ اور معاذ بن جبلؓ رونے لگے اور حضرت عمرؓ کی ہچکی بندھ گئی۔

آج وہی مسجد اقصیٰ اور اس کا صحن اسرائیل کی غزلہائے رواں کے جڑاواں ناچ سے داغدار ہو رہا ہے۔

نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

حکومت کیسی ہونی چاہئے۔ اس سوال پر کئی صدیوں سے غور ہو رہا ہے۔ ادھر مغرب کے سیاسی افکار کی بالادستی کو اصرار ہے کہ پچھلی دو صدیوں میں انسانوں کو جو بنیادی حقوق ملے ہیں یا عوام کو اپنے حکمران منتخب کرنے کا جو حق حاصل ہوا ہے' وہ تمام تر مغربی افکار کی جدوجہد کا ثمرہ ہے' لیکن اس سوال کا جواب تیرہ صدیاں پہلے خلافت راشدہ کا نظام دے چکا ہے' رہ گئے حکمران تو ان کے اوصاف و اختیار کا پورا پورا نقشہ حضرت عمرؓ کی ذات میں منعکس ہو گیا تھا' آپ نے خلافت کی مسند پر بیٹھتے ہی جو خطبہ دیا' اس کا ایک ہی جملہ کافی ہے۔ فرمایا:

اے خدا' میں سخت ہوں' مجھے نرم کر' میں کمزور ہوں' مجھے قوت دے۔

ایک حکمران کو جو ہونا چاہئے' اس کا تمام خلاصہ اس ایک فقرہ میں سما گیا ہے' جب تک مسند خلافت پر فائز رہے' ان کی سیرت کا یہی شعار رہا' قیصر روم کا سفیر حاضر ہوا تو حیران رہ گیا' اتنا بڑا کشور کشا ایک درخت تلے کھجور کی چٹائی پر آرام کر رہا ہے' اس نے واپسی پر بیان کیا تو سارا دربار ششدر رہ گیا۔۔۔ سفیر نے کہا:

''عمر اس معاشرہ کے فرمانروا ہیں' جس کے افراد دن کو مجاہد اور رات کو زاہد ہوتے ہیں' ان پر کسی شہنشاہ کا نہیں بلکہ ایک درویش کا گمان ہوتا ہے۔''

احتساب کا یہ حال تھا کہ ماتحت گورنر جو مختلف ملکوں کے مرکزی خلافت کے نمائندہ تھے' آپ کی ہیبت سے تھرتھر کانپتے تھے۔ ایک مرتبہ گورنروں کے سامان کا جائزہ لیا تو جوتوں کا ایک ایک جوڑا چھوڑ کر باقی سارا سامان بیت المال میں بھجوا دیا۔

حضرت ابوہریرہؓ بحرین سے واپس آئے تو 12 ہزار روپے ساتھ تھے' ان سے یہ رقم لے کر بیت المال میں جمع کرا دی' فرمایا تم نے خدا کا مال چرایا ہے۔ عمرو بن عاصؓ مصر میں گورنر تھے' انہیں لکھا گورنر ہونے سے پہلا تمہارا اثاثہ اتنا تھا' اب اس سے زائد جتنا سامان فراہم کیا ہے' بیت المال میں جمع کرا دو۔

سعد بن عامرؓ بھی گورنر تھے۔ حاضر ہوئے تو ان کے پاس ایک تھیلہ' ایک لاٹھی اور ایک پیالہ تھا' آپؓ نے پوچھا: تمہارا سامان بس یہی ہے؟ کہا بس اتنا ہی' لاٹھی کے ساتھ ایک تھیلہ رہتا ہے اور پیالے میں کھانا کھا لیتا ہوں۔

عقبہ بن فرقدؓ نے کوئی لذیذ چیز پکوا کر بھجوائی'

پوچھا کُل مسلمان یہی کھاتے ہیں' بولے نہیں' فرمایا: یہ تمہارے باپ کی کمائی نہیں کہ عیاشیوں میں برباد کرتے پھرو' حکم دیا' آئندہ وہی چیزیں کھاؤ' جو عوام کھاتے ہیں۔

حضرت فارجہ بن حذافؓ نے مصر میں دو منزلہ مکان بنوایا' تو عمرو بن عاصؓ کو لکھ کر گروا دیا۔ فرمایا: اس سے ہمسایوں کی پردہ دری ہوتی ہے۔ ایران کے فاتح سعد بن ابی وقاصؓ نے کوفہ میں ایک محل بنوایا تو محمد بن مسلمہ (انسپکٹر جنرل پولیس) کو حکم دیا' جاؤ اور اس محل کو آگ لگادو۔

عیاض بن غنم (حاکم مصر) کے متعلق رپورٹ پہنچی کہ ریشم پہنتا اور دربان رکھتا ہے' محمد بن مسلمہ کو حکم دیا' عیاض کو جس حالت میں پاؤ' اسی حالت میں پکڑ کے ساتھ لے آؤ' عیاض سامنے آیا تو باریک ریشمی کرتہ پہنا ہوا تھا۔ بالوں کا کرتہ پہنایا۔ بکریوں کا ایک گلہ حوالے کیا اور فرمایا تم انسانوں پر حکومت کرنے کے قابل نہیں ہو' جاؤ اور بکریاں چرایا کرو۔

کتاب الخراج میں لکھا ہے' گورنروں اور حاکموں سے عہد لیا کرتے تھے کہ:

(1) کبھی ترکی گھوڑے پر سوار نہیں ہوں گے۔
(2) باریک کپڑا نہیں پہنیں گے۔
(3) چھنا ہوا آٹا نہیں کھائیں گے۔
(4) چپڑاسی نہیں رکھیں گے۔
(5) ضرورت مندوں کے لئے دروازہ کھلا رہے گا۔

جس عامل کے متعلق معلوم ہوتا کہ کمزور اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ فوراً موقوف کر دیتے۔ کسی عامل کا تقرر کرتے وقت اس کے مال و منال کا حساب کر لیتے اور یہ واقعہ تو عام ہے کہ ایک بھوکی عورت اور اس کے بچوں کا حال دیکھا تو آٹے کی بوری اپنی پیٹھ پر اٹھا کر لے گئے۔ خدمت گار نے اصرار کیا' فرمایا قیامت کے روز پرسش میری ہوگی' تمہاری نہیں۔

ایک مرتبہ حضرت حفصہ نے سالن میں روغن زیتون ڈال کر سامنے رکھا تو فرمایا: میں دو غذائیں تا دمِ مرگ نہیں کھاؤں گا جبکہ عوام کو ایک غذا بھی میسر نہیں ہے۔

ایک مجلس میں پینے کے لئے پانی مانگا' شہد لے آئے ہاتھ میں پیالہ لے کر فرمایا: اگر میں اسے پی لوں تو اس کی مٹھاس چلی جائے گی' لیکن تلخی دیر تک باقی رہے گی۔ یہ کہا اور پیالہ واپس کر دیا۔

ابوموسیٰ اشعریؓ بصرہ میں گورنر تھے' آپؓ کے دو بیٹے ان کے پاس بصرہ گئے۔ ابوموسیٰ اشعری نے خزانہ سے کچھ رقم دی کہ اس سے مال خرید کر مدینہ میں بیچ دیں' جو منافع ہو' خود رکھ لیں۔ اصل خزانہ میں لوٹا دیں۔ حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو بیٹوں سے پوچھا' کیا موسیٰ باقی لوگوں کے بیٹوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کرتے ہیں یا صرف تمہیں خلیفہ کے فرزند سمجھ کر یہ رعایت دی ہے؟ اس کے بعد اصل اور منافع دونوں سرکاری خزانے میں جمع کرا دیئے۔

ایک دفعہ شام کے دورے پر گئے تو شہر کے نزدیک اپنے غلام سالم کو اونٹ پر سوار کرا دیا جو لوگ استقبال کے لئے موجود تھے حیران رہ گئے بلکہ کانا پھوسی کرنے لگے فرمایا: یہ لوگ شاہان عجم کے جلوس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور یہ تھا اسلام کا وہ مثالی حکمران جس نے اپنی حکومت اور اپنی ذات کو کھلی کتاب کی طرح رکھا' تنقید کا خیر مقدم کیا اور منبر رسول ﷺ پر کھڑے ہو کر فرمایا:

''خدا اس شخص کا بھلا کرے جو مجھے میرے عیبوں کا تحفہ بھیجتا ہے۔ یعنی مجھے میری کوتاہیوں سے متنبہ کرتا ہے۔''

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزمِ طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	160/-	سورہ روم' لقمان' السجدہ	(30,31,32)	444	325/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورہ احزاب' سبا' فاطر	(33,34,35)	570	325/-
سورہ النحل	(16)	334	250/-	سورہ یٰسین	(36)	164	125/-
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	275/-	29واں پارہ (مکمل)	----	541	325/-
سورۃ الکہف وسورہ مریم	(18-19)	511	325/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	325/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	275/-				
سورۃ الانبیآء	(21)	336	225/-				
سورۃ الحج	(22)	380	275/-				
سورۃ المؤمنون	(23)	408	300/-				
سورۃ النور	(24)	263	200/-				
سورۃ الفرقان	(25)	389	275/-				
سورۃ الشعرآء	(26)	453	325/-				
سورۃ النمل	(27)	280	225/-				
سورہ القصص	(28)	334	250/-				
سورہ عنکبوت	(29)	387	275/-				

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایاز حسین انصاری

دینی مدارس اور حکومت

سعودی دارالحکومت ریاض میں ایک طرف شرعی علوم کے لئے نہایت جدید طرز کا جامعۃ الامام کیمپس اور دوسری طرف غیر شرعی یا عصری علوم کے لئے کنگ سعود یونیورسٹی کا بڑا کیمپس واقع ہے' شرعی علوم کے حاملین اور غیر شرعی علوم کے حاملین ایک دوسرے کو اپنے فکر ونظر سے خارج سمجھتے ہیں۔ یہی حال دوسرے اسلامی ممالک کا ہے۔ مسلم ممالک کی ترقی وعروج کے لئے اشد ضروری ہے کہ اس قسم کی شرعی اور غیر شرعی تقسیم کے طریقہ کو ترک کر کے سکول' کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہی دین ودنیا کی تعلیم دی جائے۔ اس مقصد کے لئے ماہنامہ طلوع اسلام کے اکتوبر 2001ء کے شمارہ میں ''دینی مدارس اور حکومت'' کے عنوان سے جناب ایاز حسین انصاری صاحب سابق چیئرمین ادارہ کا ایک نہایت جامع مضمون شائع ہوا تھا۔ مسلم امہ کی ضرورت کا تقاضا ہے کہ اس مضمون کو دوبارہ قارئین طلوع اسلام کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ (ادارہ)

صدر پاکستان نے ماڈل دینی مدارس کے قیام اور الحاق کا ''پاکستان دینی مدارس تعلیمی بورڈ آرڈیننس 2001ء'' جاری کیا ہے۔ اس آرڈیننس کا اطلاق پورے پاکستان پر ہوگا۔ لیکن اس پر عملدرآمد اس تاریخ سے ہوگا جس کا اعلان وفاقی حکومت کرے گی۔

اس آرڈیننس کے تحت وفاقی حکومت گزٹ نوٹیفکیشن جاری کرے گی اور اس کے ذریعے پاکستان مدارس ایڈوکیشن بورڈ کے قیام کا اعلان کرے گی۔ بورڈ کے کچھ فرائض مندرجہ ذیل ہیں۔

☆ دینی مدارس اور دارالعلوم قائم کرنا۔

☆ ان درس گاہوں میں جدید تعلیم دینے کا اہتمام کرنا۔

☆ دینی مدارس کے لئے نصاب تعلیم مرتب کرنا۔

☆ امتحانی نظام وضع کرنا۔

☆ اور اساتذہ کی تربیت کے لئے تفصیلی لائحہ کار کا متعین کرنا وغیرہ۔

حکومت ایسے دینی مدارس قائم کرنا چاہتی ہے جن میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیوی تعلیم بھی دی جائے

گی تا کہ ان اداروں کے طلباء دوسرے طلباء کے ساتھ شانہ بشانہ ہم آہنگ ہو کر اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کر سکیں اور بھرپور نتائج حاصل کریں۔ اس قسم کی حکومتی کوشش میں کوئی قابل اعتراض بات ہی نہیں ہے۔

(مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) جو امام الہند کے لقب سے پکارے جاتے تھے وہ اپنی مشہور تصنیف ''تذکرہ'' میں ارشاد فرماتے ہیں:

''مدتوں غور کرنے کے بعد یہ حقیقت کھلی کہ امت اسلامیہ کے تمام مفاسد کی اصلی جڑ وہی چیزیں ہیں جن کو یونانیت اور عجمیت سے تعبیر کرنا چاہئے۔ سارے برگ و بار و ثمرات فساد کا انہیں سے ظہور رونما ہوا۔ آج ہمارے مدارس میں جو علوم' باسم اصل واساس علوم شریعہ پڑھے جاتے ہیں' اگر کسی صاحب حکمت کی نظر کیمیاوی ان کی تحلیل و تغرید کرے تو کھل جائے کہ کس قدر ان کا شریعت اصلیہ اور دین خالص سے مرکب ہے اور کس قدر اس فتنہ عالم آشوب' یونانیت اور عجمیت سے؟ کوئی شے اس سے نہ بچی۔ حتیٰ کہ علوم الہیہ و تلاوت و بیان اور عملاً جزئیات اعمال و رسوم و ہیأتِ معاشرت وغیر ذالک جب یہ حال علم شرعیہ مکتبہ نام نہاد اصولیہ کا ہے تو پھر ان اساطیر و اوہام کا کیا پوچھنا' جن کو بہ لقبِ شریف ''معقولات'' پکارا جاتا ہے۔ وان من العلم جھلا۔''

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

''ان کا سرمایۂ نازعلمِ حق نہیں ہے جو تفرقہ مٹاتا اور اتباع سبلِ متفرقہ کی جگہ ایک ہی صراط مستقیم پر چلتا ہے بلکہ یکسر جدل وخلاف ہے' نفس پرستی اس کی کثافت کو خمیر کر دیتی ہے اور دنیا طلبی کی آگ اس کی ناپاکی کے بخارات اور تیز کرتی رہتی ہے۔''

(تذکرہ' صفحہ 84-83)

مولانا مودودی (مرحوم) فرماتے ہیں:

''دوسری چیز جو ہمیں اپنے نظام تعلیم میں بطور اصول پیش نظر رکھنی چاہئے اور اسی کی بنیاد پر ہمارا انتظام تعلیم ہمارا سارا نظام تعلیم بننا چاہئے وہ یہ ہے کہ ہم اس دین و دنیا کی تفریق کو ختم کر دیں۔ دین و دنیا کی تفریق کا تخیل ایک عیسائی تخیل ہے' یا بدھ مذہب یا ہندوؤں اور جوگیوں کا ہے۔ اسلام کا تخیل اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہمارے لئے اس سے بڑی کوئی غلطی نہیں ہوسکتی کہ ہم اپنے نظام تعلیم میں' اپنے نظام تمدن میں اور اپنے نظامِ مملکت میں اس دین اور دنیا کی تفریق کے تخیل کو قبول کر لیں۔ ہم اس کے بالکل قائل نہیں ہیں کہ ہماری ایک تعلیم دنیوی ہو اور ایک تعلیم دینی۔ اس کے برعکس ہم تو اس بات کے قائل ہیں کہ ہماری پوری کی پوری

تعلیم بیک وقت دینی بھی ہو اور دنیوی بھی۔''

(ص 155۔ تعلیمات مجموعہ مضامین ابوالاعلیٰ مودودی' شائع کردہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی اچھرہ۔ لاہور طبع اول 1955ء)

''مگر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ موجودہ نظام تعلیم میں ملت اسلام کے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کے لئے جو (ان درسگاہوں یعنی دینی مدارس میں) انتظام کیا جاتا ہے وہ دراصل ان کو' اس ملت کی پیشوائی کے لئے نہیں بلکہ اس کی غارت گری کے لئے تیار کرتا ہے۔'' (ایضاً ص 62)

''اب جو لوگ اس نظام تعلیم کے تحت پڑھ رہے ہیں اور اس سے تربیت پا کر نکل رہے ہیں ان کا کوئی مصرف اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ ہماری مسجدوں کو سنبھال کر بیٹھ جائیں یا کچھ مدرسے کھول لیں اور طرح طرح کے مذہبی جھگڑے چھیڑتے رہیں تاکہ ان جھگڑوں کی وجہ سے قوم کو ان کی ضرورت محسوس ہو..... وہ نہ تو اسلام کی صحیح نمائندگی کر سکتے ہیں' نہ موجودہ زندگی کے مسائل پر اسلام کے اصولوں کو منطبق کر سکتے ہیں' نہ ان کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ دینی اصولوں پر قوم کی رہنمائی کر سکیں اور نہ ہمارے اجتماعی مسائل میں سے کسی مسئلے کو حل کر سکتے ہیں۔'' (ایضاً ص 139)

بہرحال اب جب کہ یہ صورت حال ہے تو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ:

''پاکستان بھر کے پانچوں بورڈز نے ''ماڈل دینی مدارس'' کے قیام اور دینی مدارس بورڈز آرڈیننس کو مسترد کر دیا ہے اور اسے مدارس کے خلاف سازش قرار دیا ہے۔ حکومتی اسکیم میں شرکت نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور کہا ہے' کہ دینی مدارس اور جامعات کی آزادی اور خودمختاری کا ہر قیمت پر تحفظ کیا جائے گا۔''

(بحوالہ جنگ کراچی' مورخہ 29/8/2001)

حیدرآباد شہر کے 50 سے زائد دینی مدارس کے مہتمم اور منتظمین نے حکومت کی جانب سے نافذ کردہ حالیہ دینی مدارس آرڈیننس کو مسترد کرتے ہوئے مطالبہ کیا ہے کہ اس کو فوری طور پر واپس لیا جائے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس آرڈیننس کے خلاف تحریک چلائی جائے گی۔

(بحوالہ ''جنگ'' کراچی' مورخہ 04-09-2001)

مذہبی پیشوائیت کی مخالفت غیر متوقع نہیں۔ ان حضرات کی ذہنیت کچھ اس طرح کی ہے کہ وہ ہمیشہ یہی کہتے رہے ہیں۔ ''ہم یہ تسلیم نہیں کرتے''۔

دارالمصنفین (اعظم گڑھ) سے شائع ہونے والا مجلّہ ''معارف'' (جس کے مدیر سید سلیمان ندوی مرحوم تھے) مذہبی دنیا میں بڑے بلند مقام کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ اس کی ستمبر 1953ء کی اشاعت میں تحریر تھا۔

''واقعہ یہ ہے کہ ہم مولویوں' جن کا خطاب میر باقر

داماد کی ''الافق المبین'' کے الفاظ میں ''لم لا یکونیون'' اور ''لا نسلمیون'' بھی ہے یعنی لم یکون کذا (ایسا کیوں نہیں ہوسکتا) اور لا نسلم (ہم یہ تسلیم نہیں کرتے) یہ دوحربے ہمارے ہاتھوں میں ایسے ہیں کہ جب تک جس مسئلہ کے متعلق جو جی میں آئے ہم کہتے چلے جاسکتے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ ہم مدرسہ والوں کے درمیان کسی بدقسمت آدمی کی کوئی بات جا پڑے۔ جنگلوں کے درخت اور گھاس، جن سے کاغذ تیار کئے جاتے ہیں، شاید کانپ اٹھتے ہوں۔ جب ان کو خبر ملتی ہو کہ مولویوں نے ''آستینیں''، ''لم لا یکون کذا'' اور ''لا نسلم'' کہنے کے لئے چڑھائی ہیں۔ سمندر بھی تھرا اٹھیں کہ ان کا پانی بھی ہم مولویوں کے لم لا یکونیات اور لا نسلمیات کی سیاہی کے لئے کافی نہیں ہوسکتا۔ (کذا)''

اس وقت ملک میں تعلیم کے دومراکز ہیں۔ ایک مذہبی مدرسے اور دارالعلوم جن میں طالب علموں کو ''دنیا'' سے بیگانہ رکھا جاتا ہے، اور دوسرے ہمارے اسکول اور کالج، جن میں طلباء دین سے ناآشنا رہتے ہیں۔ یہ ہیں تعلیم کے دو الگ الگ دوائر جن کا نتیجہ ''دین اور دنیا'' میں وہ بعد و تضاد اور عدم اعتماد و انتشار ہے۔ اس بعد اور ثنویت (Dualism) کی ذمہ دار خود ہماری حکومت ہے۔ وہ ایک طرف مذہبی مکاتب اور دارالعلوموں کی اس قدر حوصلہ افزائی اور امداد کرتی ہے کہ ان کا دائرہ اثر و نفوذ دن بدن وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ دوسری طرف، ہمارے اسکول اور کالج ہیں، جن کا نصاب تعلیم ایسا ہے جس سے طالب علم، دین کی غایت وحقیقت سے یکسر بیگانہ رہتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جو کچھ انہیں اسلام کے نام سے پڑھایا جاتا ہے اس سے، دین سے جاذبیت پیدا ہونے کی بجائے، ان کی نفرت اور بڑھ جاتی ہے۔

طلوع اسلام مسلسل چلّا رہا ہے کہ ملک سے، تعلیم کی اس دوعملی کو ختم کیا جائے۔ مذہبی مکاتب اور دارالعلوموں کو بند کر دیا جائے اور اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم کے نصاب میں اس طرح تبدیلی کی جائے کہ طالب علم، علوم دنیاوی کے ساتھ ساتھ دین کی اصل وحقیقت سے بھی آشنا ہوتے چلے جائیں اور اس طرح وہ اپنی ارضی زندگی کو سماوی اقدار کے ساتھ ہم آہنگ کر کے، صحیح اسلامی زندگی کا نمونہ پیش کرسکیں۔ دوسری طرف، قوم کو اس انتشار وخلفشار سے نجات مل جائے جو مذہبی مکاتب اور دارالعلوموں سے وبا کی طرح پھوٹ کر ملک کے امن کو خطرے میں ڈالتے رہتے ہیں۔ طلوع اسلام نے مسلسل ومتواتر حکومت کی توجہ اس خطرہ کی طرف مبذول کرائی۔ لیکن حکومت نے اس سے بے اعتنائی برتی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس خطرہ کے متعلق

صدر محترم کو خدشہ ہے کہ وہ کہیں پیدا نہ ہو جائے' وہ پیدا ہو رہا ہے۔ ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ مذہب سے بیگانہ ہی نہیں متنفر ہو رہا ہے اور مذہب پرست طبقہ وہ پوزیشن حاصل کئے جا رہا ہے جو ازمنہ مظلمہ میں' یورپ میں' احتساب (Inquisition) کے علمبردار' پادریوں نے حاصل کر لی تھی اور جس کے بعد' عیسائیت کو وہاں کی عملی زندگی سے دیس نکالا مل گیا تھا۔

طلوع اسلام نے مارچ 1967ء کی اشاعت میں' محترم صدر مملکت کی خصوصی توجہ اس حقیقت کی طرف منعطف کرائی تھی کہ ملک کے نظام تعلیم میں جو' دوعملی پائی جاتی ہے۔۔ وہ دوعملی جس کی رو سے مذہبی تعلیم مکتبوں اور دارالعلوموں میں دی جاتی ہے اور ''دنیاوی'' تعلیم اسکولوں اور کالجوں میں۔۔ اس سے قوم کی زندگی میں وہ ثنویت پیدا ہو رہی ہے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ اس سے پاکستان کی سالمیت مخدوش ہو رہی ہے۔ کیونکہ پاکستان کی تو بنیاد ہی اس نظریہ پر تھی کہ اسلام کی رو سے ''دین اور سیاست'' میں کوئی بعد نہیں یہ دونوں ایک ہیں۔ طلوع اسلام نے گزارش کیا تھا کہ حکومت اس ثنویت کو ختم کرنے کے لئے مناسب اقدام کرے۔

صدر صاحب نے جو حالیہ آرڈیننس نافذ کیا ہے یہ مبارک اقدام ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں ہماری گزارش یہ ہے کہ یہ ایک عظیم انقلابی اقدام ہے جس کے لئے ملک گیر جدید نظامِ تعلیم وضع کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ۔

(i) ملک میں صرف اسکول اور کالج رہیں۔ مذہبی مکاتب اور دارالعلوم بند کر دیئے جائیں۔

(ii) نصاب تعلیم میں الگ اسلامیات کا شعبہ نہیں رہنا چاہئے۔ اس لئے کہ اس الگ شعبہ سے پھر وہی ثنویت پیدا ہو جاتی ہے۔ (یہ ''اسلامیات'' کیا ہے اور اس کے نتائج کیا۔ اس کے متعلق ہم تفصیل سے کبھی پھر لکھیں گے)

(iii) نصاب تعلیم ایسا ہو کہ طلباء کو جو مضمون بھی پڑھایا جائے' اس میں بتایا جائے کہ قرآن کریم اس باب میں کیا تعلیم دیتا ہے اور اس کے ماحصل کو کس طرح اسلام کی پیش کردہ مستقل اقدار انسانیت کے تابع رکھا جا سکتا ہے اس کے ساتھ ہی انہیں روزمرہ کی زندگی میں ان امور سے روشناس کرا دیا جائے جن کی سرانجام دہی کے لئے آج کل ایک الگ مولوی کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔

(iv) اسلامی قانون کے بنیادی اصولوں کی تعلیم لاء کالج میں دی جائے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے' نظام تعلیم کی یہ تبدیلی کوئی معمولی تبدیلی نہیں' یہ بہت بڑی تبدیلی ہوگی۔ اس لئے

اس کے لئے بڑے عزم، ہمت، محنت اور تدبر کی ضرورت ہو گی۔ لیکن اگر یہاں یہ تبدیلی پیدا ہوگئی تو ہم یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کو عالم اسلام ہی میں نہیں، اقوام عالم میں ممتاز ترین مقام حاصل ہو جائے گا۔ اس لئے کہ

(1) جس قوم میں مذہبی پیشوائیت موثر ہو گی وہ قوم کبھی مقام آدمیت تک نہیں پہنچ سکے گی۔ اور

(2) جو قوم خدا کی طرف سے عطا کردہ مستقل اقدار (قرآن) سے بے بہرہ رہے گی۔ اسے انسانیت کی سطح نصیب نہیں ہو سکے گی۔

''دین اور دنیا'' کی تعلیم کے ادغام سے مراد یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت کو ختم کر کے، قوم کے نوجوان طبقہ کو مستقل اقدار خداوندی سے روشناس کرایا جائے۔ اس سے یہ صحیح مقام انسانیت تک پہنچ سکیں گے۔ اس نصب العین کو سامنے رکھ کر اس کی طرف تدریجاً بڑھتے چلے جانا چاہئے۔ واللہ المستعان۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نوجوانوں کا طبقہ کسی ملک اور قوم کا طغرہ (Crast) ہوتا ہے جس سے وہ قوم پہچانی جاتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ قوموں کی تقدیر ہمیشہ ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ان نوجوانوں کے قلب و دماغ کی صلاحیتیں، ان کے گرم خون کی حرارتیں، ان کا زور بازو، ان کا جوش کردار ایک کف بداماں سیلاب کی طرح اٹھتا ہے اور ہر ٹکرانے والی قوت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ قوموں کی تخلیق ان کے نوجوانوں کے کوہ شکن ارادوں کی رہین منت ہوتی ہے۔ اس لئے یہی طبقہ تھا جسے طلوع اسلام نے اپنے تصورات کی آماجگاہ، اپنی امیدوں کا مرکز، اپنی تمناؤں کا محور اور قوم کے مستقبل کا مظہر قرار دیا اور اسی کو اپنے پیغامات انقلاب آفریں کا درخور تخاطب سمجھا اور انہی کے لئے عصر حاضر کے مفکر پرویز صاحب اقبال ہی کے الفاظ میں دعا مانگتے رہے کہ ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

طلوع اسلام پاکستان کے اندر مسلسل مرض کی نشاندہی کرتا چلا آ رہا ہے کہ ان بیچاروں کی صحیح تعلیم کا بندوبست کر دیا جائے۔ کیونکہ آپ جس قسم کی قوم بنانا چاہیں اس کے بچوں کو اس قسم کی تعلیم دیتے جایئے۔ تعلیم بدل جانے سے نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے اور زاویہء نگاہ بدلنے سے اشیاء کی اقدار بدل جاتی ہیں۔ جب اقدار بدل جائیں تو دنیا کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔ ایسی تعلیم کے لئے طلوع اسلام نے یہ حل پیش کیا کہ پاکستان کے اندر ایسی درسگاہیں قائم کی جائیں جن کی تعلیم کا محور خدا کی کتاب یعنی قرآن حکیم ہو اور یہ درسگاہیں ایسے طالب علم تیار کریں کہ:

1- پاکستان میں وقتاً فوقتاً جو مسائل سامنے آئیں وہ بتا سکیں کہ اس باب میں قرآن کیا رہنمائی دیتا ہے۔

2- اسلامی مملکت کا آئین کیسا ہونا چاہئے اور قوانین کس قسم کے۔

3- افراد کی زندگی اسلامی قالب میں کس طرح ڈھل سکتی ہے اور معاشرہ قرآنی خطوط پر کس طرح متشکل ہوسکتا ہے۔

4- وہ کونسی ایسی عملی کسوٹی ہے جس سے ہر وقت معلوم کیا جا سکے کہ قوم صحیح راستے پر چل رہی ہے یا اس کا کوئی قدم غلط سمت کی طرف اٹھ گیا ہے۔

5- دنیا کی مختلف قومیں اس وقت جن معاشرتی، سیاسی، قومی، بین الاقوامی مسائل سے دوچار ہیں اور جن کا کوئی اطمینان بخش حل نہیں ملتا جس کی وجہ سے امن عالم سخت خطرے میں پڑ رہا ہے قرآن حکیم ان مسائل کا حل کیا تجویز کرتا ہے۔

6- اس درس گاہ کے فارغ التحصیل طالب علم ایسی قابلیت کے مالک ہوں کہ وہ دنیا کے بڑے بڑے اجتماعات میں قرآنی نکتہء نگاہ نہایت وضاحت سے پیش کرسکیں اور اپنے ملک میں بھی دوسروں کی رہنمائی کرسکیں۔

7- ذہنی قابلیت کے علاوہ ان کا کیریکٹر بھی اتنا بلند ہونا چاہئے کہ وہ دوسرے نوجوانوں کے لئے قابل تقلید مثال پیش کرسکیں اور اس طرح اس حقیقت کی زندہ شہادت بن سکیں کہ جب انسانی قلب و دماغ قرآن کے قالب کے اندر ڈھل جائیں اور وہ سیرت نبی اکرم ﷺ کو اپنے سامنے بطور اسوۂ حسنہ رکھ لیں تو اس سے کس طرح ایسے انسان پیدا ہوتے ہیں جن پر انسانیت فخر کرسکے۔

طلوع اسلام نے جو فکر پیش کی ہے اس کے متعلق پاکستان کے ممتاز قانون دان اور سابق وحدت مغربی پاکستان کے چیف جسٹس جناب اے۔آر۔کیانی (مرحوم) نے 1961ء کے زرعی یونیورسٹی فیصل آباد کے جلسہء تقسیم اسناد کے موقع پر فرمایا۔

''تعلیمی درس گاہوں کے پیش نظر یہی نہیں ہونا چاہئے کہ طالب علم ایک معینہ مدت کے بعد صرف اسناد ہی لے کر فارغ ہوں بلکہ وہ اسناد کے ساتھ ان درس گاہوں سے انسان بن کر بھی نکلیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ طلباء ان درسگاہوں سے انسان بن کر نکلیں، تو ان درسگاہوں کے اندر آپ کو لامحالہ اس فکر کو اپنانا ہوگا جو ''طلوع اسلام'' نے پیش کی

ہے۔''

طلوع اسلام کہتا ہے کہ ملت کی کشتِ ویراں کونم اس آب نشاط انگیز سے حاصل ہوتا ہے جسے قرآن کہتے ہیں۔قرآن کے مقرر کردہ حدود و قیود ہی وہ پختہ ساحل ہیں جو حیاتِ انسانی کی جوئے رواں کا رخ متعین کرتے ہیں۔لیکن انسانی دنیا کے اندر یہ انقلاب صحیح تعلیم کی رو سے لایا جاسکتا ہے۔اس لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ ان بچوں کی صحیح تعلیم کا بندوبست کر دیا جائے۔ان کی گزرگاہوں کو وہ ساحل مہیا کر دیئے جائیں جن کی بنیاد ان قوانین پر ہو جو قرآن حکیم کی دفتین میں موجود ہے۔جنہیں کہیں باہر سے Import کرنے کی ضرورت نہیں۔یہی وہ واحد طریقہ ہے جس سے ملک وقوم کی یہ عظیم متاع محفوظ ہوسکتی ہے۔اگر ایسا ہوگیا تو مجوزہ تعلیمی درسگاہیں ایسی درس گاہیں بن جائیں گی جو ان درس گاہوں سے مختلف ہوں گی۔جن کے متعلق اکبر نے کہا تھا۔

ع افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ہم صدر محترم کی خدمت میں بصد ادب گزارش کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جہاں فکر بلند اور قلب حساس کی نعمتوں سے نوازا ہے۔وہاں آپ کو مملکت کے وسیع ترین اختیارات بھی حاصل ہیں۔آپ اگر ان تینوں چیزوں کو یکجا کر کے' تھوڑی سی ہمت کر لیں تو آپ یقیناً اسلام کو اس تاسف انگیز انجام سے بچا سکتے ہیں۔جو انجام عیسائیت کا ہوا ہے۔اس سے آپ کا نام اس دنیا میں بھی تاریخ کے اوراق پر سورج کی کرنوں سے لکھا جائے گا اور آخرت میں بھی اسلام' آگے بڑھ کر' آپ پر تہنیت وتبریک کے پھول نچھاور کرے گا۔

آپ کی شکایت

یہ بھی درست کہ رسالہ نہیں پہنچا یا وقت پر نہیں ملا اور یہ بھی کہ تعمیل ارشاد میں تاخیر ہوئی یا اس میں کوئی فروگزاشت ہوئی۔

لیکن کیا آپ نے اس پر بھی غور فرمایا کہ آپ نے

۱۔ تبدیلی پتہ کی بروقت اطلاع دی ہے یا نہیں۔

۲۔ خط وکتابت کرتے وقت خریداری نمبر لکھا ہے یا نہیں۔

۳۔ زرشرکت ادا ہوا ہے یا نہیں۔

۴۔ اپنے علاقے کے پوسٹ کوڈ کی اطلاع دی ہے یا نہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

قرآن کے نظامِ عدل کے چند بنیادی اصول

قرآنی نظام عدل کے نفاذ میں رنگ، نسل، خون، زبان اور وطن کا اختلاف کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اصل (Origin) کے اعتبار سے تمام انسان ایک امتِ واحدہ ہیں۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً (یونس 10:19)۔

اور تمام فرزندانِ آدم کو یکساں واجب التکریم بنایا ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ (بنی اسرائیل 17:70)۔

''الناس'' میں اپنے اور پرائے، مومن و کافر سب شامل ہیں۔ قرآن کریم اس لئے خدا کا تصور بطور ''رب العالمین''، اس کے رسول کا تصور بطور ''رحمتہ للعالمین'' اور خود قرآن کا تصور ''ذکر للعالمین'' کا دیتا ہے۔

ان میں تقسیم دو گروہوں میں خود اللہ نے آئیڈیالوجی کی بنا پر کی ہے۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَمِنكُم مُّؤْمِنٌ (التغابون 64:2)۔

اللہ وہ ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا۔ سو تم میں بعض کافر ہو گئے اور بعض مومن۔

اسی سے دوقومی نظریہ کا وجود ہوا، جو نظریہ پاکستان کی بنیاد کہلایا۔

قرآن سے ہمیں واضح ہدایت ملتی ہے کہ اس نظامِ عدل کے نفاذ کے لئے ضروری ہے کہ خود اسلامی مملکت تمام افرادِ معاشرہ کو بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی پابند ہو۔

وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِيْ الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ھود 11:6)۔

زمین میں کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔

قرآن کا کہنا یہ ہے کہ جو مملکت قوانینِ خداوندی کے نفاذ کے لئے وجود میں آتی ہے' وہ ان تمام ذمہ داریوں کو اپنے اوپر لے لیتی ہے جنہیں خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ اسی ذمہ داری کے احساس نے امیر المومنین حضرت عمرؓ کی زبان سے ادا کرائے' تاریخ میں یہ الفاظ زبان زدِ عام ہیں کہ خدا کی قسم! اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا پیاسا مر جائے تو قیامت کے دن عمر سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

یہ مملکت تمام افراد کو اس کی ضمانت دیتی ہے کہ:

نَّحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (الانعام 6:151)۔

ہم تمہیں بھی اور ان کو بھی رزق دیتے ہیں۔

رزق سے مراد ہیں وہ تمام اسباب و ذرائع جن سے انسانی جسم اور اس کی ذات کی نشو ونما ہوتی جائے۔ ہوسکتا ہے کہ ہماری بات احباب کو اجنبی محسوس ہو اور شاید باعثِ اطمینان بھی نہ ہو۔ لہٰذا ضروری ہے کہ بتایا جائے کہ اس امر کی وضاحت ہمیں قرآن ہی سے حاصل ہوتی ہے۔

وَمَا لَكُمْ لاَ تُقَاتِلُونَ فِيْ سَبِيْلِ اللّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاء وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَـذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيّاً وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيْراً (النساء4:75)۔

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں جنگ کے لئے نہیں اٹھتے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ستم رسیدہ' کمزور و ناتواں مرد' عورت' بچے کس طرح پکار پکار کر ہم سے فریاد کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے' جس کے رہنے والوں نے ظلم و ستم پر کمر باندھ رکھی ہے' کسی طرح نکال لے۔ اپنے ہاں سے ہمارے لئے کوئی سرپرست بھیج۔ کوئی مددگار ادھر پہنچا۔

اس آیت میں جنگ کی اجازت کی بات ہو رہی ہے جس کا اعلان کرنا صرف اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مدینہ کی اسلامی مملکت کو مکہ میں رہ جانے والوں کی خدا سے فریاد کی پکار کے جواب میں ان کی مدد کے لئے اکسایا جا رہا ہے۔

یہاں دیکھنے کی بات ہے کہ مکہ کے مظلوم' خدا سے دعا کر رہے ہیں اور خدا اپنی اس مدد کرنے کی ذمہ داری بجا لانے کے لئے مدینہ کی اسلامی مملکت سے کہہ رہا ہے' کیا تم سن نہیں رہے۔ وہ ہمیں پکار رہے ہیں' تم ان کی مدد کو کیوں نہیں پہنچتے۔ اسی سے بھی اخذ کیا جاتا ہے کہ خدا کی ذمہ داریاں' اس کے نام پر حکومت حاصل کرنے والی اسلامی مملکت پوری کرتی ہے۔

اسی آیت سے دعا کا یہ مفہوم بھی سامنے آتا ہے

کہ خدا دعا کرنے والے کی مدد براہِ راست نہیں کرتا' بلکہ اسلامی حکومت کے ذریعے کرتا ہے' جو اسے اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ کم از کم تاریخ میں امیر المومنین حضرت عمرؓ کا خطبہ تو اسی فریضہ کی غمازی کرتا ہے' جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ:

انی بینکم و بین اللہ۔ ویس بینی و بینہ احدا۔ وان اللہ قد الزمنی دفع الدعاء عنہ۔

لوگو! یاد رکھو۔ میں تمہارے اور اللہ کے درمیان ہوں لیکن میرے اور اس کے درمیان کوئی نہیں۔ اللہ نے مجھے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو اس تک پہنچنے سے روک لوں۔

عزیزانِ گرامی دعا کا مقصد ہی اپنی ذات میں بہتری لانا ہے۔ اسی ضمن میں علامہ اقبالؒ نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا ہے کہ:

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تُو بدل جائے

انسان کی بنیادی ضروریات کی فراہمی کے ساتھ' قرآن مملکت کو' انسان کو اس کے انفرادی ذوقِ حسن (Aesthetic Sense) سے محروم کرنے کی بھی ممانعت کرتا ہے۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيَ أَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالْطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ (الاعراف 7:32)۔

ان سے کہو کہ وہ کون ہے' جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو جنہیں خدا نے اپنے بندوں کے ذوق کی تسکین کے لئے بنایا ہے اور خوشگوار سامان زیست کو حرام قرار دے۔

قرآن کے نظام عدل کے نفاذ کے لئے ضروری ہے کہ معاشرہ میں ہر انسان' محض انسان ہونے کی حیثیت سے یکساں واجب الاحترام قرار پائے۔ کسی انسان کو دوسرے پر درجہ دے کر فوقیت دینے کا ایک اور صرف ایک ہی معیار قرآن نے رکھا ہے اور وہ یہ کہ درجہ اسے حاصل ہو گا جو اپنے اعمال کی بنا پر زیادہ تقویٰ شعار ہوگا۔

وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوا (الاحقاف 46:19)۔

ہر ایک کے مدارج ان کے اعمال (کاموں) کے مطابق مرتب ہوں گے۔

اور اس ضمن میں قرآن میں ہدایت ہے کہ:

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات 49:13)۔

تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے' جو سب سے زیادہ تقویٰ شعار (قوانین کی نگہداشت کرنے والا) ہے۔

یاد رہے کہ قرآن جب سب لوگوں سے جمع کے صیغے میں مخاطب ہوتا ہے تو ان میں سب مرد اور عورتیں شامل ہوتی ہیں اور ان کو برابر کی سطح پر رکھا جاتا ہے۔ یہی عدل کی Demand ہے۔

نظامِ عدل کے تحت احترامِ آدمیت کا لازمی نتیجہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا غلام یا محکوم نہ رہے۔ ہر ایک کو یکساں طور پر آزادی حاصل ہو۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُؤْتِيَهُ اللّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُواْ عِبَاداً لِّي مِن دُونِ اللّهِ (آل عمران 3:79)۔

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے قوانین، حکومت اور نبوت عطا کرے اور وہ دوسرے لوگوں سے کہے کہ تم خدا سے ورے میرے غلام اور محکوم بن جاؤ۔

نظامِ عدل میں انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہا گیا کہ:

إِنِ الْحُكْمُ إِلاَّ لِلّهِ (یوسف 12:40)۔

حاکم ہونے کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔

اس لئے کہ لا اللہ الا اللہ کا عملی مفہوم ہی یہی ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کو اقتدار اور اختیار نہیں کہ وہ کسی کو اپنا محکوم اور تابع فرماں (چہ جائیکہ غلام) بنا سکے۔ اس کی مزید وضاحت یوں ملتی ہے کہ:

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (المائدہ 5:44)۔

جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتا (جو حکومت خدا کی کتاب کے مطابق قائم نہیں ہوتی) تو یہی لوگ کافر ہیں۔

قرآن نے عدل کے حتمی حکم کے ساتھ احسان کا بھی حکم دیا ہے۔

إِنَّ اللّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ (النحل 16:90)۔

یہ حقیقت ہے کہ اللہ تمہیں عدل اور احسان دونوں کا حکم دیتا ہے۔

تمام انسانوں کو پیدائش کے اعتبار سے یکساں سمجھنا، ہر ایک کے لئے صلاحیتوں کی نشو ونما کے لئے یکساں مواقع مہیا کرنا اور سعی و عمل کے لحاظ سے ان کے مقامات و مدارج متعین کرنا، محنت کے مطابق معاوضہ دینا، کسی کے حقوق و واجبات (Dues) کو سلب نہ کرنا اور تمام امور کے فیصلے اس قانون کے مطابق کرنا جو سب پر یکساں طور پر نافذ ہو، عدل کہلاتا ہے۔

لفظ احسان کا مادہ حسن (ح س ن) ہے، جس کے

معنی ہوتے ہیں کسی کی کمی پورا کر کے' اس کے بگڑے ہوئے توازن کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں حسن کا احیاء کرنا۔ اس سے ان کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے' جن کی محنت کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے مکتفی نہ ہو۔ تاکہ ان پر عدل کیا جا سکے۔

ظلم عدل کا نقیض ہے' جو معاشرہ میں خوف وحزن کا موجب بنتا ہے۔ لہٰذا مملکت کا یہ بھی فریضہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے قوانین بنا کر ان پر عمل کروائیں تاکہ ظلم بھی نہ رہے اور امن بھی ہو۔ اس سے ہر شخص کو حقیقی اطمینان دلا کر عدل کا تقاضہ پورا ہوسکتا ہے۔

لاَ تَظْلِمُونَ وَلاَ تُظْلَمُونَ (البقرہ 2:279)۔

نہ کسی پر ظلم کرو اور نہ ہی اپنے آپ پر ظلم ہونے دو۔

اس سے معاشرہ میں

فَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ (البقرہ 2:38)۔

لوگوں کو کسی قسم کا خوف اور حُزن نہیں ہوگا۔

قانون کی دانستہ خلاف ورزی جرم کہلاتی ہے' چونکہ اس سے نظامِ عدل ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کی روک تھام جرم کی سزا سے کی جاتی ہے' اسے قصاص کہتے ہیں۔ اس کے متعلق قرآن کی ہدایت ہے:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَاْ أُولِي الأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (البقرہ2:179)۔

اے صاحبانِ عقل وبصیرت! تمہارے لئے قصاص میں زندگی کا راز پوشیدہ ہے تاکہ تم متقی بن سکو۔

اس لئے کسی کو اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ کسی کو ناحق جان سے مار دے۔

مَن قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعاً وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعاً (المائدہ5:32)۔

جو کوئی قتل کرے ایک جان کو بلا عوض جان کے یا بغیر فساد کرنے کے ملک میں تو گویا قتل کر ڈالا اس نے سب لوگوں کو اور جس نے زندہ رکھا ایک جان کو تو گویا زندہ کر دیا سب لوگوں کو۔

عدل کا یہ بھی تقاضا ہے کہ ہر شخص اپنی ذمہ داری خود اٹھائے۔ صلاحیت رکھتے ہوئے دوسروں پر بوجھ نہ بنے۔

وَلاَ تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلاَّ عَلَيْهَا وَلاَ تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى (الانعام6:164)۔

کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں

اٹھائے گا۔

کوئی کسی کی محنت کے ماحصل کو نہ غصب کر سکے گا نہ اس میں کمی۔ اسے اس کے واجبات پورے کے پورے حاصل ہوں گے۔

وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَى (النجم 53:39)۔

انسان کو وہی ملے گا' جس کی اس نے محنت کی ہو۔

اس سلسلے میں قرآن کی تعلیم یہی ہے کہ جو کام کرنے کے قابل ہونے کے باوجود دوسروں کی محنت کے ماحصل پر زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ گداگر ہے۔ خواہ کتنا ہی دولت مند کیوں نہ ہو۔ جو لوگ محنت سے معذور ہو چکے ہوں' قرآن دوسروں کی فاضلہ دولت میں سے ان کے حصہ کو حق قرار دیتا ہے۔

حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (المعراج 70:23-25)۔

لوگوں کے (فاضل) اموال میں سائل ومحروم کا حق ہے (یعنی خیرات نہیں)۔

نفاذ عدل میں قرآن نہ صرف مملکت کو اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرتا ہے' بلکہ اسلامی مملکت کے شہریوں کو بھی انفرادی طور پر فرائض سونپتے ہوئے ہدایت کرتا ہے کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ كُونُواْ قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاء لِلّهِ وَلَوْ عَلَى أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالأَقْرَبِينَ إِن يَكُنْ غَنِيّاً أَوْ فَقِيراً فَاللّهُ أَوْلَى بِهِمَا فَلاَ تَتَّبِعُواْ الْهَوَى أَن تَعْدِلُواْ وَإِن تَلْوُواْ أَوْ تُعْرِضُواْ فَإِنَّ اللّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيراً (النساء 4:135)۔

اے مومنو! تم ہمیشہ عدل کے علمبردار بن کر رہو۔ شہادت صرف اللہ کے لئے دو خواہ وہ خود تمہارے اپنے خلاف کیوں نہ جائے۔ فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے۔ لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عمل نہ کرو اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔

قرآن میں خصوصی طور پر وکلاء کے لئے بھی ہدایت ہے۔

وَلاَ تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيماً (النساء 4:105)۔

تو خیانت کرنے والوں کے (Cause) کو (Plead) کرنے والوں میں سے مت ہو۔

بلکہ ان کو اس کوشش میں رہنا چاہئے کہ:

فَلَنْ أَكُونَ ظَهِيراً لِّلْمُجْرِمِينَ (القصص

28:17)۔

میں کبھی مجرموں کا پشت پناہ نہیں بنوں گا۔

آخر میں قانون کے متعلق قرآن کے بنیادی اور اساسی اصول پر روشنی ڈالنا چاہوں گا۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ:

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقاً وَعَدْلاً لَّا مُبَدِّلِ لِكَلِمَاتِهِ (الانعام6:115)۔

اس (قرآن) میں 'خدا کا ضابطہ قوانین یعنی کلمات تمام صداقتوں کو اپنے اندر لئے' اور عدل و توازن کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے' مکمل ہو چکے ہیں۔ اب ان کلمات میں کوئی تغیر و تبدل کرنے والا نہیں۔

دوسری جگہ ہے کہ:

وَلاَ تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلاً (بنی اسرائیل 17:77)۔

اور تو ہماری سنت میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا۔

یہاں دونوں آیات میں قانون جب الفاظ کی شکل میں ہو' تو اسے کلمہ کہیں گے اور جب وہ عمل میں آ جائے تو اسے سنت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عدل میں غیر متبدل قانون کی بہت اہمیت ہے۔ قرآن میں قانون کا لفظ نہیں آیا۔ دراصل اس زمانہ میں قانون کا لفظ ابھی روشناس ہی نہیں ہوا تھا دیکھا جائے تو قانون سے مراد یہ ہے کہ:

If.... then.... always

اگر تم ایسا کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا اور ہمیشہ ایسا ہی ہوگا۔

جب قانون کی یہ اصطلاح نظامِ کائنات کے ضمن میں استعمال کی جائے تو اس سے مراد ہوتی ہے سلسلہ علت و معلول (Cause & effect) یعنی فلاں بات کا نتیجہ یہ ہوگا۔ یا اس بات کا سبب یہ ہے۔

اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے۔ لیکن اس نے اپنے لامحدود اختیارت اور لاانتہا اقتدارات پر خود ہی کچھ پابندیاں عائد کر لی ہیں۔ انہی پابندیوں کا نام قانون خداوندی ہے۔ قرآن نے قانون کو امر کے نام سے بھی متعارف کرایا ہے۔

وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَراً مَّقْدُوراً (الاحزاب 33:38)۔

اور اللہ کا امر اس کی مشیت کی رو سے مقرر شدہ پیمانوں کے مطابق بنتا ہے۔

انہی قوانین کی پابندی میں ہی کائنات کا نظام حسن و خوبی سے چل رہا ہے۔ اس قسم کے قوانین اس نے انسانی زندگی کے لئے بھی عطا کر دیئے ہیں اور کہہ دیا ہے کہ اگر تم ان کے مطابق چلو گے' تو یوں ہوگا۔ ان کی خلاف ورزی کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ اس کو قانونِ مکافاتِ عمل کہا جاتا ہے۔

یہ قوانین غیر متبدل اور اٹل ہیں اور ہر انسان پر یکساں طور پر حاوی ہیں۔ زمان و مکان کا اختلاف یا شخصیتوں کی تفریق ان پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوتی۔

حضرت عمرؓ نے انہی اصولوں کی مدد سے عدل کے قانونی پہلو کی درجِ ذیل فہرست روشناس اور نافذ کرائی تھی۔ یاد رہے کہ یہ اصول آج سے تقریباً پندرہ صدیاں پہلے مرتب ہوئے تھے۔ آج بھی مغرب کے قانون کی جو تعلیم نصاب میں دی جا رہی ہے کہ وہ اب انہی اصولوں کو متعارف کرا رہے ہیں اور یا پھر ابھی بھی ان کی تلاش میں ہیں:۔

(1) قضا' فریضہ خداوندی اور سنت رسول ﷺ اللہ ہے۔ اس سے اس ذمہ داری کی اہمیت واضح ہے۔

(2) فیصلے میں نتیجہ پر ہر پہلو پر غور و تحقیق کے بعد پہنچنا چاہئے اور اس میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔

(3) فیصلہ تحریری ہونا چاہئے۔ زبانی فیصلہ بے سند ہوتا ہے۔

(4) فیصلہ وہی فیصلہ کہلا سکتا ہے جسے نافذ کر دیا جائے۔

(5) دورانِ سماعت' فریقین کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ کرو تاکہ کمزور فریق' انصاف کی طرف سے مایوس نہ ہو۔

(6) بارِ ثبوت مدعی کے ذمہ ہوگا۔

(7) مدعا علیہ اگر شہادت نہ پیش کر سکے تو اس سے حلف لے لینا چاہئے۔

(8) فریقین میں مصالحت کی کوشش کرنی چاہئے مگر ایسی مصالحت نہیں جس میں حلال کو حرام اور حلال کو حرام کا درجہ دے دیا جائے۔

(9) اگر آپ نے آج ایک فیصلہ کیا ہے اور کل کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے تو اس فیصلہ سے رجوع کر لینا آپ کے منصب کے منافی نہیں۔

(10) جب کسی معاملہ میں نصِ صریح نہ ملے تو اس کے نظائر و امثال کی جستجو کرو اور ان پر غور و فکر کے بعد فیصلہ کرو کہ کونسی بات حق سے زیادہ قریب ہے۔ اس پر اعتماد کرو۔

(11) مدعی یا مدعا علیہ میں سے جو بھی ثبوت یا گواہ پیش کرنے کے لئے مہلت مانگے' اسے مہلت دے دو۔

(12) گواہی کے لئے ہر مسلمان ثقہ ہے بجز ان کے جنہیں کسی جرم کی پاداش میں ساقط الاعتبار قرار دے دیا گیا ہو۔

(13) فیصلہ ظاہری بیانات اور شہادت پر ہوگا۔ پوشیدہ امور اور نیتوں کا علم صرف خدا کو ہے۔

(14) تمہارے دل میں اہلِ مقدمہ کی طرف سے کبھی خفگی' اکتاہٹ یا چڑ چڑاپن پیدا نہیں ہونا چاہئے۔

(15) ہمیشہ تحمل اور بردباری سے کام لینا چاہئے۔

(16) شبہ کی صورت میں' سزا دینے کے مقابلہ میں سزا نہ دینا بہتر ہے۔

(17) غصے کی حالت میں فیصلہ نہ کرو۔اسے ملتوی کردو۔

(18) یاد رکھو۔قاتل' مقتول کا وارث نہیں ہوسکتا۔

(19) لوگوں کے فیصلے کرتے وقت' ہمیشہ اپنے آپ کا محاسبہ کرتے رہو۔

(20) دوسروں سے بات اس انداز سے کرو' جس سے صاف صاف مطلب اس کی سمجھ میں آجائے۔

(21) اگر کوئی شخص ایسی زبان میں کسی کو امان دے یا نہ دے جس کو وہ نہ سمجھتا ہو اور وہ اسے اپنے لئے امان سمجھ لے' تو اسے امان ہی تصور کرو۔

(22) اگر کوئی معقول عُذر پیش کرے' تو اسے قبول کرلو۔

(23) مجبور اپنے کسی فعل کے لئے قابلِ مواخذہ قرار نہیں پاسکتا۔

(24) اپنے ایک گورنر کو سرزنش کی کہ تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنانا شروع کیا۔ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا۔

(25) جو قاضی کسی فریق مقدمہ کی پوزیشن کا خیال رکھتا ہو' وہ انصاف نہیں کرسکتا۔

محترم خریدارانِ طلوعِ اسلام!

آپ کو مجلّہ طلوعِ اسلام جب بذریعہ ڈاک موصول ہو تو براہِ کرم لفافہ کو پھینکنے سے پہلے اس کے اوپر اپنے زرِشرکت سے متعلق تحریر کو ضرور پڑھیئے جس پر آپ کا خریداری نمبر اور جس مہینہ اور سال تک آپ نے زرِشرکت ادا کیا ہو' وہ مہینہ اور سال اس طرح لکھا ہوتا ہے:

Subscription Paid Up to 12/2009

اس طرح آپ کو ادا شدہ یا واجب الادا زرِشرکت سے متعلق ایک نظر ڈالنے پر معلوم ہوتا رہے گا۔نیز زرِشرکت بھیجتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔ایڈریس کی تبدیلی کی صورت میں مہینہ کی 15 تاریخ تک ادارہ کو مطلع کیجئے تاکہ اس ماہ کا پرچہ آپ کے نئے پتہ پر ارسال کیا جاسکے۔

(ادارہ طلوعِ اسلام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

سبعا من المثانی والقرآن العظیم

عربی زبان کے الفاظ کا ایک مادہ ہوتا ہے جس میں بنیادی معنی ہوتے ہیں اور اس میں خصوصیت ہوتی ہے مثلاً ناشپاتی کو **نجـاس** کیوں کہتے ہیں وہ اس لئے کہ یہ purgative-laxative فروٹ ہے۔قبض کشا ہے اور نجاست کو باہر نکالنے میں آسانی پیدا کرتا ہے اس لئے اس کا نام **نجاس** ہے۔ڈاکٹر حضرات جانتے ہیں کہ ریڑھ میں spinal cord کی کیا خاصیت ہے اور اسے کتنی اہمیت حاصل ہے۔اس لئے عربی زبان میں اسے **سلسلہ** کہتے ہیں کیونکہ تمام اعصاب اس سے جڑے ہیں۔ اسی طرح قرآن کا مادہ ہے ﴿**ق۔ر۔أ**﴾۔جس کے بنیادی معنی ہیں اکٹھا کرنا۔جمع کرنا اور حفاظت سے رکھنا۔قرآن کریم لکھنے میں عربی رسم الخط اور اردو رسم الخط میں تھوڑا سا فرق ہے اس سے مفہوم تو نہیں بدل جاتا۔ ہر جگہ ایک ہی طرح پڑھا جاتا ہے۔فرق صرف لہجہ (accent) میں ہوتا ہے جس طرح ایک پنجابی شخص اردو بولے تو پتہ چل جاتا ہے کہ اردو اس کی مادری زبان نہیں ہے۔ایسے ہی عربوں کی طرح ہم عربی الفاظ کی ادائیگی نہیں کر سکتے جس طرح انگریز انگلش بولتے ہیں ہم اس طرح pronounce نہیں کر سکتے۔ برطانیہ میں لیورپول شہر کے رہنے والوں کا لہجہ (accent) مانچسٹر والوں سے ذرا مختلف ہے اور سکاٹ لینڈ والوں کا بالکل ہی الگ۔ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہے لیکن چاروں صوبوں کی مادری زبان اپنی اپنی ہے اور ان کی لغت اپنی اپنی ہے۔اسی طرح برطانیہ میں ویلش لوگوں کی مادری زبان انگلش نہیں ہے۔ان کی لغت بولی (dialect) language الگ ہے لیکن سارے ملک کی سرکاری زبان انگلش ہی ہے۔بعض بکاؤ مفاد پرست پاکستانی مسلم مذہبی راہنما بلواسطہ یا بلاواسطہ اپنے الفاظ قراءات اور سبعہ (احرف) غیر متداولہ کے نام سے قرآن کریم کو بدلنے کے لئے چاہے کتنا ہی زور لگالیں یہ اللہ کی حفاظت میں تا قیامت اپنی اصلی شکل میں باقی رہے گا۔

مادہ کے اعتبار سے کتاب اللہ کو قرآن اس لئے کہتے ہیں کہ اس نے اپنے اندر انسانی زندگی کے لئے

اصول۔قوانین واحکام، قصص، امر، نہی، وعدہ، وعید، آیات اور سورتوں کو باہمدگر جمع کیا ہوا ہے۔ نیز اس لئے بھی کہ یہ خدا کی تمام نازل کردہ کتابوں کے ثمرہ کو اپنے اندر حفاظت سے رکھے ہوئے ہے۔قرآن کریم میں ہے:

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ O فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُO(75:17-18)-

اس کا جمع کرنا اور حفاظت سے رکھنا (جس طرح رحم میں تخم حفاظت سے رکھا جاتا ہے) ہمارے ذمہ ہے۔ سو جب ہم اسے جمع کر دیں (اور اسے تمہارے سینے میں محفوظ اور ثبت کر دیں) تو تم اس جمع شدہ وحی کی پیروی کرنا اس کا اتباع کرنا (تاج)۔

ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ O(75:19)-

پھر اس کا لوگوں کے سامنے کھول کر لانا (اس کی نمود اور ظہور) بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم خود رسول اللہﷺ کی زندگی میں جمع، مرتب اور محفوظ شکل میں وجود میں آ چکا تھا۔ اڑھائی سو سال بعد جمع کی گئی روایات کی رو سے یہ صحیح نہیں کہ رسول اللہﷺ کھجور کے پتوں وغیرہ پر لکھوا کر اسے منتشر شکل میں چھوڑ گئے تھے اور بعد میں اسے یکجا کیا گیا تھا۔ علاوہ دیگر شواہد، خود لفظ قرآن اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ جمع شدہ (کتاب کی شکل) میں تھا۔

بعض کا خیال ہے کہ **قَرَأَ** عبرانی لفظ ہے جس کے معنی اعلان کرنے کے ہیں (غریب القرآن، مرزا ابوالفضل)۔اس اعتبار سے اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ (96:1)- کے معنی ہوں گے ''تو اپنے نشوونما دینے والے کی صفتِ ربوبیت کا عام اعلان کر دے۔'' یہ وہی چیز ہے جسے سورۃ مدثر میں: قُمْ فَأَنذِرْ. وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (74:2-3)- سے تعبیر کیا گیا ہے۔اس سے قرآن کے معنی اعلانِ عام ہوں گے۔لیکن روایات کی رو سے کہا جاتا ہے کہ:اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ سب سے پہلی آیت ہے جس سے وحی کی ابتدا ہوئی تھی۔ جبریل کاغذ پر لکھا ہوا لائے اور رسول اللہﷺ سے کہا کہ پڑھ ساتھ نام اپنے رب کے۔ اندازہ لگائیے نہ تو جبریل کو پتہ ہے اور نہ ہی نبوت سے سرفراز کرنے والے (خدا) کے علم میں ہے کہ میرا بندہ پڑھنا لکھنا نہیں جانتا۔ یہ وضعی روایات خدا کے عالمگیر نظامِ ربوبیت کو قائم کرنے سے گریز کا ذریعہ نہیں تو اور کیا ہے۔ خود اسی سورۃ میں آٹھ آیات آگے چل کر ایک ایسی داخلی شہادت ملتی ہے جو اس امر کی وضاحت کرتی ہے کہ یہ پہلی وحی نہیں ہو سکتی اس لئے کہ اس میں کہا یہ گیا ہے:أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَى. عَبْداً إِذَا صَلَّى (96:9-10)- کیا تم نے اسے دیکھا کہ وہ خدا کے اس بندے کو جب یہ اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی میں مصروف ہوتا ہے یا نماز پڑھتا ہے تو اسے روکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ پہلی وحی تھی تو حضورﷺ کا اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی میں مصروف ہونا یا

نماز پڑھنا اور اس سے ان لوگوں کا روکنا یہ تو اس سے پہلے کی بات ہو نہیں سکتی۔ اس لئے کہ قریش کی مخالفت' مزاحمت' تصادمات تو اس وقت شروع ہوئے جب نبوت کے بعد احکام آئے اور آپ ﷺ نے اقامتِ دین یعنی نظامِ اسلام کی تبلیغ شروع کی۔ اس لئے یہ پہلی وحی نہیں ہو سکتی۔ (روایات کے اندر سازشیں پوشیدہ ہیں) **عـظـم**۔ ہڈی کو کہتے ہیں جو انسان کے جسم میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ **عـظـم الـفـدان**۔ کسان کے ہل کی اس چوڑی لکڑی (چوؤ) کو کہتے ہیں جس کے آگے لوہے کا پھل لگا ہوتا ہے۔ ہل میں اس لکڑی کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بغیر ہل نہ کھڑا رہتا ہے اور نہ ہی کام دے سکتا ہے۔ **عـظـم الـطـریـق**۔ راستہ کے کشادہ حصے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ راستہ میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ **عـظـمـة** کے معنی تکبر وغرور' بڑائی' نیز عزت وحرمت کے بھی ہیں۔ **الـعـظـیـمـة**۔ سخت پیش آنے والی بات یا حادثہ۔ **الـنـبـاء الـعـظـیـم** (78:2)- میں سخت حادثہ یا انقلابِ عظیم کے معنوں میں۔ اور **الـقـرآن الـعـظـیـم** (15:87)۔ کے معنی ہیں زندگی کے بنیادی حقائق کا ضابطہ۔ **عـظـم الـفـدان** کی رعایت سے' قرآن کریم وہ ضابطہ ہے جس سے زندگی کی سنگلاخ زمین کاشت ہو جاتی ہے۔ جس سے راستے کشادہ ہو جاتے ہیں۔ سورۃ البقرہ میں خدا کے متعلق ہے: (2:255)- بلندیوں اور عظمتوں کا مالک اور انسان کو شرف کی بلندیاں اور زندگی کی بنیادی قوتیں عطا کرنے والا۔ **رب الـعـرش الـعـظـیـم**۔ جس کے قبضۂ قدرت میں کائنات کی اساس و بنیاد کا کنٹرول ہے۔

سورۃ الحجر میں نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا ہے کہ: **وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعاً مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْآنَ الْعَظِيْمَ** (15:87)- ہم نے تجھے **سَبْعاً مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْآنَ الْعَظِيْمَ** عطا کیا۔ **اَلْقُرْآنَ الْعَظِيْمَ** خدا کے مقرر کردہ بنیادی اصول ہیں جن کے مطابق اعمال اپنا اپنا نتیجہ مرتب کرتے ہیں اور **الْمَثَانِيْ** وہ تاریخی حقائق ہیں جو اپنے آپ کو دہراتے رہتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے ایک تو ان بنیادی اصولوں کو بیان کر دیا جن کی رو سے قوموں کو عروج وزوال حاصل ہوتا ہے (یعنی قرآن کریم) اور اس کی تائید میں وہ متعدد تاریخی شواہد بیان کر دیئے جو ہر زمانہ میں بار بار سامنے آتے ہیں۔ قرآن کی ابدی صداقتوں کو پرکھنے کا ایک اہم طریق یہ بھی ہے کہ تاریخ میں دیکھا جائے کہ فلاں قوم نے جب وہ روش اختیار کی جسے قرآن حق کی روش قرار دیتا ہے تو اس کے نتائج کیا برآمد ہوئے اور پاکستانی سٹیزنز کی طرح جس قوم نے باطل کی روش اختیار کئے رکھی تو اس کے عواقب کیا ہوئے۔ (ایک ہفتہ بھی امن سے نہیں گزرتا۔ یہ خدا کے نظام سے گریز۔ قرآن سے دوری' اس کے ساتھ ظلم اور مداہنت کا نتیجہ ہے؟)۔ شاہ رفیع الدین محدث دہلوی نے اس آیت کا

ترجمہ کیا ہے ''اور البتہ دیں ہم نے تجھ کو سات چیزیں کہ دہرائی جاتی ہیں اور قرآن بڑا۔'' اس کی تفسیریوں کی ہے کہ ''سات آیتیں وظیفہ کہا سورہ فاتحہ کو اور بڑا قرآن بھی اسی کو کہا ہر سورۃ قرآن ہے یہ بڑی ہے درجے میں۔'' بخاری شریف میں ابو ہریرہؓ کی روایت ہے جس میں لکھا ہے کہ قرآن کی روح ہے سات (Oft repeated) آیات (اَلْمَثَانِی) اور ہے بڑا قرآن (سورہ الفاتحۃ)۔ اتفاق سے سورۃ فاتحہ میں سات آیات' اور لفظ **سبع** کے ایک ہی معنی لینے' اور آیت کا غیر قرآنی مفہوم لکھنے میں بڑی آسانی ہے۔ تقریباً بارہ سو سال بعد ایک فرقے کے پاکستانی مذہبی علمائے کرام **سبعا من المثانی** کے بجائے سبعہ احرف اور قراءات کی نئی اختراع کا سہارا لے کر ماہنامہ رشد کے ذریعے ایک غیر متداولہ نیا قرآن چھاپنے کی خاطر رائے عامہ ہموار کرنے میں مصروف ہیں۔ پاکستان حکومت کی وزارتِ مذہبی امور اتھارٹی کبوتر کی طرح آنکھیں بند کئے ہوئے ہے۔ (اے اللہ! پاکستان کو اس سازش سے محفوظ رکھنا)۔ **سبع**۔ سات کے عدد کو کہتے ہیں لیکن اس کا مطلب صرف سات ہی نہیں ہے بلکہ عرب اسے ان معنوں میں بھی استعمال کرتے ہیں جن معنوں میں ہم کہتے ہیں کہ ''کئی ایک'' (Several) یا متعدد (Many)۔ اسی طرح **سبعون** (سَتر) بھی اسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے ہماری زبان میں بیسیوں' پچاسوں' سینکڑوں کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ اس سے مراد کوئی معین عدد نہیں ہوتا۔ یا جیسے ہم کہتے ہیں کہ تمہیں سو بار سمجھا چکے ہیں' اس سے مراد ٹھیک سو کی تعداد نہیں ہوتی۔ چنانچہ جہاں قرآن کریم میں ہے: **إِن تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً** (9:80)- تو اس کے معنی یہ نہیں کہ اگر تو ان کے لئے ستر بار مغفرت مانگے تو ہم مغفرت نہیں دیں گے اور اگر ستر سے زیادہ مرتبہ مغفرت مانگے تو مغفرت دے دی جائے گی۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ تو ان کے لئے چاہے کتنی ہی مرتبہ مغفرت مانگے انہیں مغفرت نہیں مل سکے گی۔ ان معانی کے پیشِ نظر **سَبْعَ سَمَاوَاتٍ** (2:29) کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔۔۔ یعنی متعدد اجرامِ فلکی۔۔۔۔ نہ کہ وضعی روایات کی رو سے شیشے کے بنے ہوئے اوپر تلے سات آسمان!۔ سائنس سے ثابت ہے کہ زمین سے اوپر اس نیلگوں فضا (atmosphere) کی کوئی حد ہی نہیں اس لئے اوپر تلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سورہ البقرہ کی آیت (2:261) میں متعدد کے معنی واضح ہیں جہاں کہا گیا ہے کہ: **مَّثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِّئَةُ حَبَّةٍ** ۔۔۔ ''ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے اپنی دولت کو کھلا رکھتے ہیں ایسی ہے جیسے ایک دانہ سات بالیں اُگائے اور ہر ایک بالی میں سو سو دانے ہوں''۔ ظاہر ہے کہ یہاں **سَبْعَ سَنَابِلَ** سے مراد متعدد (کئی۔ several) بالیں ہے۔

کسی کسان سے دریافت کرلیں وہ آپ کو بتائے گا کہ گندم کے پودے کی (exactly) سات ہی بالیں نہیں ہوتیں۔

میرے پاس سعودی عرب' لبنان' انڈیا اور پاکستان کے چھپے ہوئے قرآن ہیں۔ ان سب میں ''اقرأ'' یوں یعنی الف کے اوپر (ء) ڈال کر لکھا ہوا ہے۔ اس لئے اردو رسم الخط میں قرأت اس طرح لکھا جاتا ہے۔ لفظِ قرأت کا مادہ بھی (ق۔ر۔أ) ہے۔ اس کے بنیادی معنی حروف اور الفاظ کو ایک دوسرے کے ساتھ ملانے اور جمع کرنے کے ہیں۔ اس سے مطلب پڑھنا۔ (Recite) ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا ہے لغت کے معنی Dialect ہے جس کا مطلب ہے

(Form of speech characteristic of a district or of a defined group of speakers)
(Form of speech varying from a recognized standard)

اس لفظ کے دوسرے معنی ہیں word اور ایک معنی ہیں Lexicon۔ جس کا مطلب ہے حروف کے ساتھ کھیلی جانے والی گول کھیل (Round game played with letters) اور طریق کے لئے الفاظ way اور style استعمال کئے جاتے ہیں۔ مولا جانے ان کے نزدیک نزولِ قرآن کے لئے سات way سے مراد کیا ہے؟۔ کیونکہ کتب روایات میں اس کے لئے (way, style, dialect) تینوں الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ بخاری کی پانچ روایات میں (Dialect) ہے اور مسلم میں دو ایسی روایات ہیں جن میں (dialect اور style) دونوں الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ ان دو روایات کے ایک ہی راوی ابی ابنِ کعبؓ ہیں۔ ان کی روایت میں سے ایک میں (dialect) لکھا گیا ہے اور دوسری میں (dialect) اور (style) دونوں۔ ایک میں ہے کہ میں مسجد میں تھا ایک اور آدمی اندر داخل ہوا اس نے نماز میں مجھ سے مختلف (style) میں پڑھا۔ پھر ایک اور آدمی داخل ہوا اس نے دوسرے آدمی سے مختلف (style) میں پڑھا۔ جب ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو میں نے یہ سب ان کو بتایا۔ آپ ﷺ نے دونوں آدمیوں سے ایک ایک کر کے قرآن سنا تو فرمایا ٹھیک ہی تو پڑھتے ہیں۔ میں سن کر حیران سا رہ گیا۔ حضور ﷺ نے میری چھاتی (struck) کی میں پسینہ پسینہ ہو گیا آپ ﷺ نے فرمایا مجھے پیغام بھیجا گیا تھا کہ قرآن ایک (dialect) میں پڑھا جائے۔ میں نے اپنے لوگوں کی سہولت کے لئے بذریعہ جبریل تین چار دفعہ اللہ سے درخواست کی' معاملہ سات پہ طے پا گیا۔ (معزز قارئین حوصلہ نہیں ہے' پوری تفصیل سے لکھنے کو جی نہیں چاہتا اس لئے مختصر لکھا جا رہا ہے)۔ دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جبریل ان کے پاس آیا اور اس نے کہا

کہ اللہ نے حکم دیا ہے کہ آپ کی امت ایک (dialect) میں قرآن پڑھیں۔ پھر واپس بھیجا۔ جبریل کے تین چار چکروں کے بعد سات (dialect) میں قرآن خوانی کی رعایت حاصل ہوگئی۔ روایات نمبر (1889-1887)۔ حوالہ دینا ضروری ہے تاکہ کوئی بھی شوق پورا کر کے اپنے علم میں مزید اضافہ کرلے۔ بخاری جلد 4' روایت نمبر 442۔ راوی ہیں ابنِ عباسؓ۔ بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جبریل نے میرے لئے ایک (way) سے قرآن پڑھا (i.e. dialect) اور میں اسے لگاتار بار بار مختلف طریقوں سے پڑھنے کو کہتا رہا حتیٰ کہ اس نے سات مختلف (ways) طریقوں سے پڑھا۔ سوچئے! نبی کریم ﷺ کے اڑھائی سو سال بعد' بغیر کسی (written) ریکارڈ کے جمع کی جانے والی روایات میں' کیا یہ کھیل قوم کی سہولت کے لئے کھیلا جارہا ہے یا مزید انتشار پھیلانے کے لئے؟

اختلافِ قرأت کا عقیدہ: اختلافِ قرأت لہجے یا طرز کی بات نہیں ہے بلکہ روایات کی رو سے اس کے یہ معنی ہیں کہ مروجہ قرآنی نسخوں میں جس انداز سے آیات موجود ہیں' ان میں سے بہت سی آیات' ان سے مختلف الفاظ میں نازل ہوئی تھیں اور اکابرین صحابہؓ کے پاس ایسے مصاحف (قرآن کے تختے) تھے جن میں وہ آیات اس طرح درج تھیں جس طرح (بقول ان کے) وہ درحقیقت نازل ہوئی تھیں (یہ تمام تفصیل ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع شدہ کتاب ''مقامِ حدیث'' میں ملے گی)۔ چنانچہ آپ قرآن مجید کے تراجم اور تفاسیر میں اکثر ایسا لکھا دیکھیں گے کہ یہ آیت ''اس قرآن'' میں تو یوں ہے لیکن قرأتِ حضرت ابنِ عباسؓ (وغیرہ) میں (مختلف الفاظ کے ساتھ) اس طرح آئی ہے۔ سوچئے! کہ اس سے وحی پر کچھ بھی یقین اور اعتماد باقی رہ جاتا ہے جو حضور نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئی تھی۔ اگر کوئی شخص کتاب مقامِ حدیث سے الرجک ہو تو وہ احمد رضا خاں' بریلوی فرقے کا لکھا ہوا قرآن کنزالایمان دیکھ لے۔ اس میں کسرِ صلوٰۃ والی آیت (4:101) کے تفسیری حاشیہ میں لکھا ہے کہ یہ آیت حضرت ابنِ عباسؓ کی قرأت میں بغیر (ان یفتنکم) ہے اور آیت (4:117) کی تفسیر میں ہے کہ اس میں لفظ اِنَاثاً کی بجائے قرأت میں (اَوْثَانَا) ہے۔

وضو کرتے وقت سُنی عوام پاؤں دھوتے ہیں اور شیعہ پاؤں دھوتے نہیں' پاؤں کا صرف مسح کرتے ہیں۔ یہ اختلافِ قرأت کا نتیجہ ہے۔ سورۃ المائدہ کی وضو والی آیت (5:6) میں پاؤں دھونے کے لئے لفظ اَرْجُلَکُمْ (ل زبر کے ساتھ) ہے جو گرامر کی رو سے فَاغْسِلُوْا (دھونے) سے جڑتا ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ فلاں صحابیؓ کی قرأت میں اَرْجُلِکُمْ (ل زیر کے ساتھ) ہے۔ اس لئے اس کا تعلق وَامْسَحُوْا (مسح کرنے) سے ہے۔ (ہم صرف چار ہی آیات کا حوالہ پیش کر رہے ہیں۔ اشرف علی تھانوی مرحوم

کی طرف سے تفسیر کی دو بڑی جلدیں اختلافِ قرأت سے بھری پڑی ہیں)۔

معزز قارئین! آگے پڑھنے سے پہلے حیاء سے کہئے کہ وہ آنکھیں بند کر لے۔ غیرت سے کہئے کہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جائے اور شرم سے کہئے کہ وہ اپنا منہ چھپا لے کیونکہ اب بہت نازک بات سامنے آ رہی ہے۔ نکاح سے متعلق سورۃ النساء کی آیت کا ٹکڑا ہے۔ ''**فما استمتعتم به منهن**'' متعہ کے جواز میں ہے کہ ابنِ عباسؓ۔ ابی بن کعبؓ اور بہت سے صحابہؓ کی قرأت میں **منهن** کے بعد **الی اجل مسمی** ہے (یعنی تم عورتوں سے متعہ کرو ایک میعادِ مقررہ کے لئے)۔ معاذ اللہ۔ متعہ سے متعلق قرأت والی روایات اور ان کی شرحیں سنیوں کی اپنی کتابوں کے اندر بھی موجود ہیں اور کتابیں وہ ہیں جنہیں غیر متلو وحی کہا جاتا ہے۔ جنہیں قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل (**مثله' معه**') ٹھہرایا جاتا ہے۔ جن کی تعلیم سے ہمارے ''علمائے کرام'' کو سندِ فضیلت ملتی ہے۔ جن کے درس نمازوں کے بعد مسجدوں میں باعثِ سعادتِ کونین تصور کئے جاتے ہیں۔ جنہیں مسلمان اس لئے سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں کہ ان کے ذریعے سنتِ رسول ﷺ اور سنتِ صحابہ کبارؓ کی اطاعت کی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ ان کتابوں میں ہے۔ ان روایات کی رو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جو آیات قرآن میں درج ہیں وہ اسی شکل میں نازل نہیں ہوئی تھیں بلکہ مختلف صحابہؓ کی قرأتوں کی رو سے ان کی تنزیلی شکلیں کچھ اور بھی تھیں۔ یہ مختلف لہجوں یا طرزوں سے ''تلاوت'' یا پڑھنے کی بات نہیں ہے۔ روایات سے ثابت کیا گیا ہے کہ حضور ﷺ نے کسی ایک کو کچھ اور دوسرے کو کچھ اور طرح سے پڑھایا۔ (معاذ اللہ)۔

آپ سوچئے کہ ایسے عقائد کے بعد' قرآن مجید کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے' اور ہم جو دنیا کے سامنے یہ دعویٰ پورے حتم و یقین کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ اس کتاب میں ایک حرف اور نقطہ کا بھی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ اس دعویٰ کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟ اور اس کے بعد سوچئے ایسی کتاب نازل کرنے والے (خدا) کے متعلق (معاذ اللہ) کیا تصور قائم ہوتا ہے' جو متضاد احکام نازل کر دیتا ہے؟ اور اگر خدا نے ایک ہی شکل میں نازل کیا تھا۔ تو اگلی صورت یہی سامنے آتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (معاذ اللہ) کسی کو کچھ پڑھایا اور دوسرے کو کچھ اور۔ اس صورت میں سوچئے کہ خدا کے رسول ﷺ کے متعلق (معاذ اللہ) کیا تصور سامنے آتا ہے اور اگر یہ صورت بھی نہیں تو سوچئے کہ قرآن سے متضاد قرأتیں کیوں اور کیسے وجود میں آئیں؟ مخالفینِ قرآن کے ہاتھوں کھلونا بننے والے مذہبی رہنماؤں کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ:
أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُواْ نِعْمَةَ اللّهِ كُفْراً وَأَحَلُّواْ

قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ (14:28)-(تم خدا کے قانونِ مشیت کو سامنے رکھ کر اقوامِ عالم کی تاریخ پر نگاہ ڈالو اور) ان رہنمایانِ قوم کی حالت پر غور کرو جنہیں اللہ نے زندگی کی خوشگواریاں اور فراوانیاں عطا کیں لیکن انہوں نے اس کی قدر نہ کی (زیادہ سمیٹنے کی خاطر) اپنی ملت کے کارواں کو ایسی منڈی میں لا کر ٹھہرا دیا جہاں اس جنس کاسد کا کوئی خریدار نہ تھا۔ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ (14:29)۔ یعنی انہیں تباہی اور بربادی کے جہنم میں جھونک دیا اور یہ کیسی بری جگہ تھی جہاں انہوں نے اس قافلہ کو اتارا! وَجَعَلُوا لِلّٰهِ أَندَادًا لِّيُضِلُّوا عَن سَبِيلِهِ ۔ انہوں نے کیا یہ کہ (نام تو لیتے رہے قوانینِ خداوندی کا لیکن) اس کے ہم پایہ ٹھہراتے رہے غیر خداوندی قوانین کو، تا کہ اس طرح لوگوں کو، خدا کے تجویز کردہ راستے سے بہکا کر دوسرے راستے پر ڈال دیں۔ قُلْ تَمَتَّعُوا فَإِنَّ مَصِيرَكُمْ إِلَى النَّارِ (14:30)۔ تم ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم نے بھی ایسی ہی روش اختیار کر رکھی ہے۔ سو اس سے تھوڑے دنوں تک فائدے حاصل کر سکتے ہو۔ اس کے بعد، تمہارے لئے بھی جہنم کی آگ ہے۔ مَیں جب بھی سورۃ الزمر کی ایک آیت پڑھتا ہوں تو ان کے جھلنے والے، رات کی تاریکی کے ٹکڑے کا نقاب اوڑھے چہرے میرے سامنے آ جاتے ہیں اور سوچتا ہوں کہ یہ لوگ دین کے راستے میں روک بن کر کیوں اپنی آخرت خراب کر کے جہنم کا ایندھن بنتے ہیں اور وہ آیت ہے: أَفَمَن يَتَّقِي بِوَجْهِهِ سُوءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَقِيلَ لِلظَّالِمِينَ ذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْسِبُونَ (39:24)-سورۃ النحل میں ان لوگوں کے متعلق ہے: لِيَحْمِلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُم بِغَيْرِ عِلْمٍ أَلَا سَاءَ مَا يَزِرُونَ (16:25)-(چونکہ معاشرہ میں انہیں ممتاز حیثیت حاصل ہے، اس لئے ان کی دیکھا دیکھی، عوام بھی اسی روش پر چلے جاتے ہیں، یہ ہیں وہ لوگ جو یوم قیامت (ظہور نتائج کے وقت)، اپنے اعمال کا پورا بوجھ اپنی پیٹھ پر لادے ہوں گے، اور ان لوگوں کے اعمال کا کچھ حصہ بھی، جنہیں یہ اس طرح بر بنائے جہالت گمراہ کر رہے ہیں۔ اُف! کس قدر بُرا ہے وہ بوجھ جسے یہ لوگ اپنے اوپر لادے جا رہے ہیں۔ اے اللہ! ملک وقوم کی بھلائی کے لئے انہیں عقل دے کر سوچنے سمجھنے کی توفیق دے۔

ایک عظیم قرآنی خزانہ

قرآن مجید پر غور و فکر کرنے والوں کے لئے خوشخبری

مفکرِ قرآنِ مجید علامہ پرویزؒ صاحب کی زندگی بھر کی قرآنی بصیرت کو DVD پر دیکھا اور سنا جا سکتا ہے۔

قیمت 20 کراؤن فی سی۔ڈی علاوہ ڈاک خرچ میں طلب کیجئے۔

سی ڈی اور کتب کی خریداری ☆ بیرون ملک bazmdenmark@gmail.com

☆ اندرون ملک، فون: 5753666 42 92+، ای میل: trust@toluislam.com

پاکستان میں
غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ

کا درس قرآن کریم مندرجہ ذیل منظور شدہ مقامات پر ہوتا ہے

نوٹ: نمائندگان محترم سے التماس ہے کہ ایڈریس یا اوقاتِ درس میں تبدیلی کی صورت میں ادارہ کو فی الفور مطلع فرمائیں۔

شہر	مقام	دن	وقت
ایبٹ آباد	234-KL کیہال۔رابطہ۔گل بہار صاحبہ	بروز جمعہ	10AM
ایبٹ آباد	234-KL کیہال۔رابطہ: شیخ صلاح الدین'فون۔0992-334699'موبائل0321-9813250	بروز جمعہ	بعد نماز جمعہ
اسلام آباد	برمکان ڈاکٹر انعام الحق' مکان نمبر302' سٹریٹ نمبر57' سیکٹرF-11/4 رابطہ: ڈاکٹر انعام الحق'فون نمبر051-2290900' موبائل:0333-5489276	بروز اتوار	11AM
اوکاڑہ	برمکان احمد علی' بیت الحمد'180-AB-4' شادمان کالونی' ایم۔اے جناح روڈ' رابطہ میاں احمد علی:0442-527325' موبائل:0321-7087325	بروز جمعہ	3PM
پنج کسی	برمطب حکیم احمد دین۔رابطہ فون نمبر:	بروز جمعہ	3PM
جہلم	جنجوعہ ٹاؤن' پوسٹ آفس فوجی ملز' نزد بیکن ہاؤس سکول۔رابطہ فون نمبر:	ہر ماہ پہلی اور آخری اتوار	4PM
چوٹی زیریں	بردوکان لغاری برادرز' زرعی سروس' ڈیرہ غازی خان۔رابطہ: ارشاد احمد لغاری۔موبائل:0331-8601520	ہر ماہ پہلا اتوار	12 بجے دن
چنیوٹ	11/9-W' گوجر چوک (گنبد والی کوٹھی) سیٹلائیٹ ٹاؤن۔ رابطہ: آفتاب عروج'فون:047-6331440-6334433۔	بروز جمعہ	بعد نماز جمعہ
حیدر آباد (قاسم آباد)	محترم ایاز حسین انصاری' B-12' حیدر آباد ٹاؤن' فیز نمبر2' قاسم آباد بالمقابل نسیم نگر آخری بس سٹاپ۔رابطہ فون:022-654906	بروز جمعہ	بعد نماز عصر
راولپنڈی	فرسٹ فلور' کمرہ نمبر114' فیضان پلازہ۔کمیٹی چوک۔ رابطہ ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ' موبائل:0332-5479377	بروز جمعہ بروز اتوار	4PM 4PM
راولپنڈی	برمکان امجد محمود' مکان نمبر14/A' گلی نمبر4' راہِ طلوع اسلام' جنجوعہ ٹاؤن' اڈیالہ روڈ' نزد جراہی سٹاپ' راولپنڈی۔رابطہ: رہائش:051-5573299' موبائل:0322-5081985	بروز اتوار	10AM
خان پور	بمقام مکان حبیب الرحمان' محلہ نظام آباد' وارڈ نمبر9 خان پور' ضلع رحیم یار خان رابطہ: نمائندہ حبیب الرحمٰن۔فون نمبر گھر:068-5575696' دفتر:068-5577839	بروز جمعہ	3PM

سیالکوٹ	معرفت کمپیوٹرسٹی،سٹی ہاؤس،سٹی سٹریٹ،شہاب پورہ روڈ، رابطہ: محمد حنیف،03007158446۔محمد طاہر بٹ،0300-8611410۔ محمد آصف مغل0333-8616286۔سٹی ہاؤس052-3256700	ہر دوسرے اتوار	5PM
سرگودھا	B-4، گلی نمبر7، بلاک21،نزد کلی مسجد چاندنی چوک،رابطہ۔ملک محمد اقبال۔فون:048-711233	بروز منگل	7PM
فیصل آباد	رحمان نور سینٹر،فرسٹ فلور،مین ڈگلس پورہ بازار،رابطہ: محمد عقیل حیدر،موبائل:0313-7645065	بروز جمعہ	4PM
فتح پور،سوات	فتح پور،سوات،رابطہ: خورشید انور،فون:0946600277،موبائل:0303-8621733	بروز اتوار	3PM
	محترم ظاہر شاہ خان آف علی گرام،سوات کا ڈیرہ۔موبائل:0346-9467559	ہر اتوار	9AM
کراچی	105 سی بریز پلازہ،شاہراہ فیصل۔رابطہ شفیق خالد،فون نمبر:0300-2487545	بروز اتوار	10AM
کراچی	A-446 کوہِ نور سنٹر،عبداللہ ہارون روڈ،رابطہ محمد اقبال۔فون:021-35892083،موبائل:0300-2275702	بروز اتوار	10AM
کراچی	ڈبل اسٹوری نمبر16،گلشن مارکیٹ،کورنگی نمبر5۔ رابطہ: محمد سرور۔فون نمبرز:021-35031379-35046409،موبائل:0321-2272149	بروز اتوار	2PM
کراچی	نالج اینڈ وزڈم سنٹر،ڈی۔2،گراؤنڈ فلور،ڈیفنس ویو،نزد اقراء یونیورسٹی۔رابطہ: آصف جلیل فون نمبر:021-35801701،موبائل:0333-2121992، محمود الحسن۔فون:021-35407331	بروز اتوار	11AM
کوئٹہ	صابر ہومیو فارمیسی توغی روڈ۔رابطہ فون:081-825736	بروز اتوار	4PM
گوجرانوالہ	شوکت نرسری، گل روڈ، سول لائنز۔رابطہ: موبائل:0345-6507011	بروز جمعہ	بعد نماز عصر
لاہور	B-25، گلبرگ2، (نزد مین مارکیٹ،مسجد روڈ)۔رابطہ فون نمبر:042-35714546	بروز اتوار	10AM
لاڑکانہ	برمکان اللہ بخش شیخ نزد قاسمیہ محلہ جاڑل شاہ،رابطہ فون:074-4042714	بروز جمعہ	بعد نماز مغرب
ملتان	شاہ سنز پاکستان (پرائیویٹ) لمیٹڈ،وہاڑی روڈ،(بس سٹینڈ چوک سے تقریباً اڑھائی کلومیٹر وہاڑی کی طرف) ملتان۔رابطہ فون نمبر:061-6538572،موبائل:0300-7353221	بروز جمعہ	3:30PM
منڈی۔۔ بہاؤالدین	رابطہ: خان محمد،(وڈیو کیسٹ) بر مکان ماسٹر خان محمد گلی نمبر1،محلہ صوفی پورہ۔فون نمبر:0456-502878	بروز جمعہ	10 AM
نواں کلی،صوابی	رابطہ بابو اسرار اللہ خان،معرفت ہومیو ڈاکٹر ایم۔فاروق،محلہ خدر خیل۔فون نمبر:	بروز اتوار	10 AM
صوابی	بمقام چار باغ،(حجرہ ریاض الامین صاحب)،(رابطہ: انچارج یوٹیلیٹی سٹورز،مردان روڈ،صوابی)	بروز اتوار	3 P.M

فون نمبرز:(0938)310262, 250102, 250092

غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ کی جملہ تصانیف اور ماہنامہ طلوع اسلام کا تازہ شمارہ بھی انہی جگہوں پر دستیاب ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(یکے از مطبوعات ادارہ باغبان ایسوسی ایشن)

سبز انقلاب

☆ باغبان ایسوسی ایشن کا ماٹو ''**قرآن فہمی اور باغبانی**'' ہے۔

☆ باغبانوں کے غیر رسمی اجتماعات ہر ماہ کی 15-30 تاریخ کو ہوتے ہیں۔ جن میں باغبان اپنے تجربات، مشاہدات اور دیگر نظری معلومات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی خاص، منفرد قسم کی بات یا دوسروں تک پہنچانے کی ضروری چیز ہو تو اسے نوٹ کر کے باغبان ایسوسی ایشن کے مرکز تک بھی پہنچا دیتے ہیں۔ اس طرح وہ نکتہ ریکارڈ پر آ جاتا ہے۔

☆ باغبان ایسوسی ایشن کی ممبر شپ پوری دنیا میں سب سے آسان ہے۔ سالانہ چندہ صرف دو روپے اور کوئی سے 10 عدد پھلدار پودہ جات کی فہرست اور اپنے شناختی کارڈ کی فوٹو سٹیٹ دے کر ممبر شپ حاصل کی جا سکتی ہے۔ تاحیات ممبر شپ کے لئے -/100 روپے یک مشت ادا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جس کی رسید جاری کی جاتی ہے۔

﴿مری میں باغبانی کے 100 سال﴾

مری میں باغبانی 14-1913ء سے شروع ہوئی تھی۔ جب بیرونی پودہ جات مری میں لگانے کی ابتدا ہوئی۔ اس سے پہلے صرف مقامی پھلدار پودہ جات تھے۔ باغبانوں سے التماس ہے کہ وہ چند معلومات میں تعاون فرمائیں۔ 100 سال کی عمر کے پرانے بزرگوں سے پوچھ کر بتائیں کہ مری میں کس نے؟ کب؟ اور کیا کچھ باغبانی کے لئے کیا۔

☆ **آیئے ہفتۂ شجرکاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور سبز انقلاب کے لئے کام کریں۔**

☆☆☆☆☆☆☆

پتہ رابطہ: (1) ملک حنیف وجدانی، صدر باغبان ایسوسی ایشن، سنبل سیداں، نیو مری

(2) صبینہ یاسمین، سینئر نائب صدر، باغبان ایسوسی ایشن، ٹبی سیداں، سوہاوہ، جہلم

(3) تنویر صادق، نائب صدر، باغبان ایسوسی ایشن، مکان نمبر 6/18، گلی نمبر 1، میاں چنوں، خانیوال

JIHAD IS NOT TERRORISM

W A R

By

Ghulam Ahmad Parwez

English Rendering by

Shahid Chaudhry

==========

In the previous chapter we have already discussed the circumstances in which the Quran permits war. In this context there is nothing new to add save one aspect.

Objections against War

One school of thought believes that whatever the circumstances, war in any case is a barbarity and madness and it cannot be justified, let alone permitted. It is the law of the jungle, a reminder of the time in human history when conflicts were settled by brutal force and not by reason and evidence. Therefore, in the present age of intellect and knowledge, and also of culture and civilisation, it cannot be allowed even as the last resort. It is against human dignity to force men to accept a particular point of view; Men have been endowed with intellect and culture and should settle their conflicts and disputes by negotiations. War is a brutal act. Love, peace, harmony, accord, mercy are all jewels of humanity. Fire and blood destroy them. Well, on paper this teaching appears to be very appealing, balanced and humane. And those who oppose this teaching are always considered cruel and cold–hearted. But the question is: does this teaching appear good only in the world of words or, can it be implemented in practice?

Christian Viewpoint

In the Old Testament orders for war are unambiguously listed. A major portion of this Scripture is devoted to wars fought by the Children of Israel. For instance, see chapter 13 in the Book of Numbers. Therefore, Jews cannot object to war. Christianity pretends to be the biggest champion of anti-war philosophy. The New Testament states

'Do not resist him that is wicked; but whoever slaps you on your right cheek, turn the other also to him.' [1]

Therefore, let us look at Christianity first. In my book *Shola-e-Mastoor* (The Hidden Flame) I have discussed the life and teachings of Jesus Christ in detail. I have said that Jesus did not preach cowardice. This element was introduced into Christianity by St. Paul at the time when Christians were in hopeless circumstances and, as the survivors of a revolutionary community, they were being charged with rebellion. Consequently, this teaching was evolved in order to save them from the oppressive and tyrannical government of the day. Thus a philosophy detrimental to Man's freedom and self-respect became part of Christianity.

Evidence from Christians

How much has this philosophy damaged humanity?

Non-Muslim philosophers and historians who have objectively studied history have answered this question. The German philosopher Nietzsche was of the opinion that Christianity has always supported the weak, downtrodden and rotten elements of society. Its aim is to eradicate all self-respecting intellectual prowess of Man. Highly intellectualised brains have been destroyed by it.

But, in the second volume of his history of European morality, he writes that Christianity gave birth to humility and lowliness; and these qualities remained appropriate and suitable for quite a considerable period. But this philosophy of humility could not keep pace with rapid development of culture till the end. For progress and civilisation it is essential that a community should have the mindset for self-respect and freedom. Humility and lowliness are counter-progressive.

G. A. Dorsey, the famous historian of civilisations, has asserted that today millions of people feel that Christianity is the religion of the defeated. They accept the religion and thus admit solemnly its defeatist spirit. "Nothing is satisfactory in life", they argue. "Desire for satisfaction is wrong and satisfaction of wrong desires is sin" is a slogan which makes a true and healthy life impossible. It destroys humanity.[2]

"Love your enemies," is an order which is impossible to implement. W. A. Brend writes in his book *Foundation of Human Conflicts* that the order of the New Testament to love your enemies is a psychological impossibility. Samuel Lowy has echoed similar thoughts in his book *Man and Fellow Man*. And the writer of *Civilisation, War and Death*, Sigmund Freud states that the order to love thy enemies is a practical impossibility. Such lofty ideals of love cannot eradicate Evil. Culture does not care for such orders. It is easy to utter this sacred order but quite difficult to follow it. [3]

---

[1] Matthew 5:39 (New World Translation)
[2] G.A. Dorsey, *Civilisation*, p.446
[3] S. Freud, *Civilisation, War and Death* pp. 78-94

"Do not resist him that is wicked" is such an order that if it is followed, all the forces of Evil in the world would be free to operate and oppression, injustice, tyranny and hardship would overpower every aspect of social and civilised life. For this reason Robert Briffault levels the grave charge against Christianity that with this wrong teaching it has always supported cruelty and oppression and in this way did away with justice and fairness. In *The Making of Humanity* he quotes the Spanish scholar, Dr. Falta de Gracia, as having stated:

> The notion of justice is as entirely foreign to the spirit of Christianity as is that of intellectual honesty. It lies wholly outside the field of its ethical vision.

Dr. Gracia further states that Christianity has been sympathetic to the oppressed people but has always forgiven cruelty and oppression. It has invited those oppressed people to the path of love who have been engrossed with difficulties and problems from all sides. It teaches them a lesson of forgiveness and pardon. It has reminded them that God is the Sustainer. But in this mayhem of religion and morality there is no scope for justice and probity. Christianity has painted a picture in which the angel-like sacred Christ descends from the sky amongst the victims of oppression and tyranny, and gives them the blessed message of Paraclete. But it is beyond his message to find out the grounds of oppression and tyranny. He does not correctly contemplate the concept of Good and Evil. To him, this cruelty and oppression is a testing time for sinners. It is also a distinctive quality of his system; this is the verdict of "God's Kingdom on Earth". St. Vincent Francis visits a living hell of a prison. There, he preaches love and asks the inmates to repent. But he does not even think of the causes which created that hell-hole in the first place. Even when the victims of oppression and cruelty cry in pain, men remain in bondage, people bleed to death, the spirit of Christianity will only console them. But Christianity will not think of the ways of eradicating oppression and tyranny because it does not think it to be its responsibility. The spirit of Christianity has remained as unconcerned towards justice and fairness as to the idea of truth. It has always taught forgiveness, tolerance and mercy. But it never remembered justice and fairness. Christianity has been influenced by unnatural moral laws of "Do not resist him that is wicked", "love your enemies", "suppress your desires", "whoever slaps you on your right cheek, turn the other also to him", etc. but no scene of oppression and tyranny shook it. [4]

More Evidence

Evil and oppression can be resisted only by power which is prohibited in Christianity. Forces of tyranny and oppression can be arrested only by power. But in

[4] R. Briffault, *The Making of Humanity* pp. 322-333

Christianity power is the right of Caesar and not God. Therefore the forces of Evil and oppression are free to do what they like. It is sinful for a victim to even think of revenge because the Kingdom is of Heaven and not of Earth. A victim has to love his oppressor because this is "an order from his God". With such an attitude on the part of theists, Evil will reign supreme in the world. We have already stated that it is impossible to follow commands such as "love your enemies" and "Do not resist him that is wicked". As such, today the thinkers and philosophers of Christianity are saying that sometimes circumstances may arise when war becomes inevitable. Dean Inge's comment on this way of combating evil deserves careful consideration. He states:

> The principle of non-resistance was laid down for a little flock in a hostile environment. But an organised society cannot abstain from the use of coercion. No one would suggest that Christian Government must not suppress a gang of criminals within its own borders, and if this is admitted, can we doubt that it should defend itself against an invading enemy? …….. Augustine held that war is justified in repelling wanton and rapacious attacks and that in preventing such crimes we are acting in the true interest of the aggressor. Without justice, what is an empire but brigandage on a large scale? Allowing that circumstances may arise which make a defensive war inevitable, we have to find principles which will guide us practically. [5]

The Archbishop of Canterbury holds a very prominent position in the Church of England. According to the news agency *Reuters*, he said that circumstances might arise in which participation in war would not be against Christian principles. [6] Similar circumstances arose in the form of the Second World War. Sir Richard Gregory has drawn a very vivid picture of this. He states that the Church of Christ blessed the Forces and their arms and it is another matter that every Christian State that took part in the war asked for help from the same God. [7]

These quotations totally reject the claim of the Christian missionaries that they oppose war because it is against culture and humanity and the message of Christianity is protest against war. Why do Christian missionaries propagate this teaching? The answer to this question would be given a little later.

Hindu Religion and War

Hinduism is a religion of war and violence. Like the Old Testament the Vedas are also full of stories pertaining to wars. They narrate the exploits of Aryans and how they conquered the non-Aryans. Besides, the Vedas also contain accounts of wars

---

[5] R. W. Inge, *The Fall of the Idols* p. 179-181
[6] Reuters: *Nation Calls* 22 December 1936
[7] R. Gregory, Religion in Science and Civilisation, p. 274

fought by their *devta*'s (gods). Rig Veda states that god Indra "killed Wartara and destroyed villages and towns, will also destroy the black Dravidians". [8] At another location the same Veda states that he (Indra) killed and destroyed fifty thousand black Dravidians in the battle. [9] For details of these wars one can go through *The Ancient Civilisation of India* by R. C. Dutt.

Furthermore, Ram and Krishna appear in Hindu history as incarnations of God. *Ramayana* and *Mahabharta* are considered sacred religious books. *Ramayana* narrates the tale of the war that Ram fought against Ravana, the king of Lanka (Sri Lanka, previously Ceylon). Mahabharata gives an account of the war fought between cousins Kauravs and Pandavs. This epic also contains *Geeta*. In this war Krishna was the charioteer of Arjun. But, once they are on the battlefield, Arjun develops cold feet and does not want to fight against his own relatives. But Krishna preaches to him the desirability of war. Thus *Geeta* is essentially Krishna's sermon in favour of war to Arjun in the battlefield. Such, then, are the exploits of Ram and Krishna on the basis of which they are considered to be incarnations of God.

Philosophy of Mahatma Gandhi …

With this backdrop it is improbable for a Hindu to oppose the concept of war. But the Hindu religion accepts all kinds of contradictory thoughts. Therefore, it is being said that Hinduism preaches *ahimsa* (non-violence) and consequently it is *parmo dharam*, or the best religion. The political leader of the Hindu community, Mahatma Gandhi, is propagating this theory of ahimsa. [10] What political gains does he want to make from this? The answer to this question is irrelevant to the theme of this book. However, the relevant question is: does the theory of *ahimsa* have the potential to be applicable in all circumstances and in every section of human life?

By *ahimsa* it is meant that one should not harbour the feeling of revenge, should not use violence to resist evil, and should not resort to violence whatever the circumstances. According to Mahatma Gandhi, *ahimsa* is the Truth. And for this reason he has been speaking in its favour for the last twenty to twenty-five years. But circumstances did arise in which the Mahatma himself advised against *ahimsa*.

… and his Confession

In an issue of *Harijan* dated 9 August 1946 there was a report that a white man insulted an African priest. Though the priest was much stronger and healthier than the white man still he said: "Please forgive me." the Mahatma's comment on this

[8] Rig Veda, Mandal 2, Mantra 20, Richa 607
[9] Ibid. 4/16/10
[10] The Urdu original version of this book was written before 1947 when Gandhi's philosophy of *ahimsa* was at its peak in India. The translator has thus retained the use of the present tense.

incident was that this was not ahimsa. This was an insult to the teachings of Christ. Courage demanded that the priest should have paid back in the same coin.

Similarly, regarding the communal riots in Calcutta in 1946, his editorial pronounced that:

> They (the victims) can retaliate or refrain. Refraining is easy and simple, if there is the will. Retaliation is complicated. Will it be tooth against or many against one? [11]

Regarding the sanctity of life, the Mahatma believes that snakes, scorpions, wolves and similar beasts and reptiles that are harmful to man should be killed. Responding to objections, he said that it is impossible for a man to avoid violence completely. Now, the question is where to draw the demarcation line? For every man it would be different. After this he writes that on the basis of *ahimsa* animals cannot be allowed to destroy the crop and that too when there is draught in the country. This is sin. Good and evil are relative things. A thing good in one particular condition might become evil in the other. [12]

This shows that according to the Mahatma *ahimsa* is a relative truth and not absolute truth; and circumstances might arise when following *ahimsa* becomes a sin. Sometimes *himsa* (violence) becomes a virtue. This is exactly what Islam teaches. According to Islam, in some situations, forgiveness and pardon are virtues and in some the Mosaic staff is justice and truth. In this context the Mahatma writes at another place that monkeys create nuisance and inflict loss. People get utterly sick of them and desire that they should die. When someone kills them these people feel joy in their heart but overtly they oppose the killing of monkeys. One friend, who is well-versed in Scriptures, asks as to what *ahimsa* states about monkeys that destroy crops and whose population is on the increase?

In answer to the above question the Mahatma writes:

> My ahimsa is my own. I am not able to accept in its entirety the doctrine of non-killing of animals. I have no feeling in me to save the lives of animals which devour or cause hurt to man. I consider it wrong to help in the increase of their progeny. Therefore, I will not feed ants, monkeys or dogs. I will never sacrifice a man's life in order to save theirs. Thinking along these lines I have come to the conclusion that to do away with monkeys where they have become a menace to the wellbeing of man is pardonable. Such killing becomes a duty. The question may arise as to why this rule should not also apply to human beings. It cannot because, however bad, they are as

---

[11] *Harijan* 25 August 1946.; *Collected Works of Mahatma Gandhi* (hereinafter referred to as *CWMG*) Vol. 92 p.45

[12] See *Harijan*, 9 June 1946; *CWMG* Vol. 91, p.61-62

> we are. Unlike the animal, man has been given the faculty of reason. [13]

Weak Argument

The last portion of the above quotation deserves attention. If any person, or a group, imitates wolves and monkeys and destroys crops, creates disorder and chaos in the land so that there is danger to life, property, freedom, women's honour, and any peaceful reasoning on humanitarian grounds against these acts is answered by violence, what should be done in such a situation? Should they be left alone to increase their nefarious activities? Should they be not stopped forcibly just because are human beings? If the answer to these questions is in the positive then no system can remain in peace and security. There is no doubt that knowledge and intellect are precious jewels by which only human beings have been blessed. But don't we observe daily that a person overcome by emotions, despite the gift of knowledge and intellect, commits crimes worst than animals would commit? The fact is that a person carried away by emotions and passions is no different from an inebriated one. Neither can see logic and reason. One can argue that dacoits and robbers are low in intellect. But what has happened to the intellect and wisdom of cultured and civilised communities of today? Almost on daily basis they are at loggerheads with each other. The memories of the Second World War are still fresh. For six long years these cultured and civilised peoples had turned this world into a hell of fire and blood and no logic or reason could stop them from committing their gruesome act. There is no doubt that, with proper upbringing, animal instinct in humans can be tamed. (That, precisely, is the objective of believing in, and following, Divine laws). But as long as such men in whom animal instinct is dominant exist, the 'rod of Moses', apart from reason, is required to protect humanity from these man-like beasts. About these beasts of men, the Quran states that they look like men but in reality they are worse than beasts. In this context the philosophers of Europe have also pondered much. They have also come to the conclusion that intellectual reasoning cannot stop war. Dean Inge observes:

> By and large the contemporary man is not militant but it is easy to infuse anger in him'. If this observation is correct, the possibility of stopping war with logic and reasoning is quite remote. [14]

Similarly, H. L. Mencken, the author of *Treatise on Right and Wrong*, writes:

> Amidst the grim conspiracy of pitting one nation against another appear those ideological interests that dream of putting an end to war. If, by some

[13] *Harijan*, 5 May 1946; *CWMG* Vol. 90 p.310
[14] . Inge, op. cit., p.193

> miracle, their desire is fulfilled, the idol of Nationalism will meet its doom and many wrong and immoral things will go along with it. The source of the power of Nationalism lies in fear and no person will fear that enemy who is armed with the weapon of justice. But the chances of war coming to an end before the end of this contemporary period are very remote. And centuries might go by before this dream is realised. Man is still quite like barbaric jungle-folk. Besides, man is not ready to forgo the pleasure that he gets when, in a fit of anger, he goes in pursuit of his enemy or fights with him. The proposals of peace put forward by different governments are in fact requisitions of their interests.
>
> These observations are based on first hand knowledge that I got by attending three international conferences that were organised to end war. After hypocritical peace of a few days, the leaders participating in the conferences resorted to grabbing and scrambling. And, when they returned to their respective countries their success was not measured by what they did for restoring peace in the world but by what material they brought for future wars. The League of Nations disintegrated when its aims became known; only after a short period of its inception this thing came out into the open. Despite all the fictional claims that were made by its founders, the fact is that their aim was merely to ensure that the war booty of the World War remained with the victorious. And the moment this business started the victorious nations were in conflict with each other over the division of the war booty. [15]

We should recall that in 1932 Professor Einstein, under the auspices of the League of Nations' National Institute of Intellectual Cooperation, invited various thinkers of the West to answer the question: Is there a way to save humanity from war?

Responding to this question Sigmund Freud, the famous psychoanalyst, writes:

> Though this will appear contradictory, the fact is that the path of achieving the desired goal of everlasting peace will be paved by war only. With war big nations would be developed and within their boundaries their central authority would make war impossible. There is only one sure way of ending war and that is to create with mutual understanding such a central authority whose decisions are final and binding on nations that happen to be in conflict of interests with each other. But, two things are required to achieve this goal; one, creation of a supreme court and two, the power to implement its decision. If latter is missing, the former will automatically become useless.

---

[15] H.L. Mencken, *Treatise on Right and Wrong* p.233

> However, the question is not to curb dominant forces of man but how to use them in fields other than war. [16]
>
> Freud concludes by saying:
>
> Intellectuals hate war because their physical nature demands it.

These are the views of those who are considered luminaries of knowledge and intellect in the world and who claim to solve every problem with logic and reasoning. The fact is that, if it had been possible to control the oppressive forces by reasoning with them, Ram would not have gone to Lanka to kill Ravana and Krishna would not have supported war in the field of Krushetra. If verbal reasoning had the potential of solving the problem of war then Krishna would have argued with Kauravas to stop the war instead of inciting Arjun to fight. Therefore, as long as oppressive forces are operating in the world, force would be required to suppress their tyranny and to protect civilised humanity. For this reason the flag-bearer of *ahimsa*, Mahatma Gandhi had to say:

> Women of India should be taught the art of using weapons. This is preferable to leaving them in a condition where they feel helpless. Women should be encouraged to keep revolvers and knives on their person. [17]

Christian Missionaries

The West is always absorbed and entangled in harassing and weakening the spirit and force of Islam. Why? This we have already answered. To achieve this objective the missionaries of the Church play the role of a vanguard for the Christian army.

These missionaries of the Church come in the guise of considerate friends. Before leaving the shores of Europe, they urge their arms industry to carry on making weapons of warfare. [18] But, in the East they preach to the Muslims the Jesuit

---

[16] S. Freud, op. cit., pp.87-93

[17] *Harijan*, 27 October 1946. Translated from Urdu version of this book as original is not available. A similar statement was however recorded in *Hindustan Times* and is reproduced here: "He (Gandhi) would far rather see India's women trained to wield arms than that they should feel helpless. He knew, however, that arms were a poor weapon when it came to the matter of defending one's honour against odds. Honour knew no surrender to any power on earth." (*Hindustan Times*, 19 October 1946; CWMG Vol. 92 p.356)

[18] Christianity preached its doctrine and prepared for war together. This is not a new thing. The Christian clergy was instrumental in instigating the Crusades. A Christian Historian writes: "When the victorious armies of the Messenger of Arabia entered Jerusalem (during the reign of the Second Caliph) not a single non-Muslim was killed on the ground that he professed a different religion. But when centuries later the Christian Crusaders entered Jerusalem then no Muslim man, woman or child was left alive."

message of "God's Kingdom is for the weak and the poor", and "whoever slaps you on your right cheek, turn the other also to him because the Kingdom of God has become your destiny"; and "the kingdom of this earth is useless and to desire it is ignominy." History has shown that the Christian missionaries have been adopting this method for centuries. They come to Muslim countries and preach to them stories of God's Kingdom and consequently the kingdom on earth of the Muslims gets transferred to other hands; yes, the same Muslims about whom their Allah said:

> The believers without doubt have entered into a transaction with Allah, through the instrumentality of the Divine order, Who purchases their very persons and their worldly possessions in return for the blissful life of *janna* [Paradise]. They shall fight in the cause of Allah and slay and be slain and on the part of Allah the promise of *janna* is binding. Similar promises were also made in the Torah and the Injeel [the Bible] and are reiterated here in the Quran. Who is better than Allah in fulfilling promises? O believers! Rejoice then on the bargain effected which is a great achievement. (9:111)

And owing to the influence of the Christian missionaries, Muslims came to believe that the prayer mat and rosary beads represent real wealth in life. They misinterpreted "contentment" and "trust in Allah", converted *Deen* into religion, consumed the opium of religion and now they are totally oblivious to the demands of *Deen*.

Sheep and Tiger (the beast & the prey)

Dr. Muhammad Iqbal in his narrative poem *Asrar-e-Khudi* (Secrets of Self) has included a thought provoking allegory about the religious leaders of the West: There lived a tiger in a jungle. The tiger harassed the sheep of that jungle. The sheep assembled together to think up a solution. A sheep, well-versed in the art of politics said, "Listen. All of us sheep combined are no match to a tiger. Therefore, we should drop the idea of becoming a tiger. Instead, we should try to change the tiger into a sheep." Consequently that sheep donned the attire of a mystic and tactfully preached to the tiger the ideology of self-denial:

> I possess spiritual power.
> I am an apostle sent by God to tigers.
> I have come as light for the blind eye,
> I have come to establish laws and give commandments.
> Repent over your blameworthy deeds!
> O plotters of evil, bethink yourselves of good!
> Whoso is violent and strong is miserable:
> Life's solidity depends on self-denial.

The spirit of the righteous is fed by fodder:
The vegetarian is pleasing unto God.
The sharpness of your teeth brings disgrace unto you:
And makes blinds your perception.
Paradise is for the weak alone,
Strength is but a means of perdition.
It is wicked to seek greatness and glory,
Penury is sweeter than princedom.

The sheep was successful in its mission. The tiger became its disciple and started living on grass and vegetables instead of meat. After some time, it began to lose its strength, swiftness and activeness and became weak, humble, spineless and a coward. It lost the sharpness of its teeth and the spark of its eyes. There were left no desires in its heart. It became like a mirror that has lost its quality of reflection. It lost all desire for making an effort, lost enthusiasm to be active and to be always on the move. Once the king of the jungle had now lost all authority, firmness, determination, command, dignity, wisdom and prosperity. Its once powerful clasp of claw became weak and it became lifeless as if it was already in its grave. Hundreds of ailments afflict the weak. As such, the tiger became disgruntled, dispirited and of vile nature. Owing to the spell of the sheep, the ever-vigilant tiger went into a slumber. Besides, "culture" was the name he gave to his disgraceful decline.

In India

When the British abolished Muslim rule in India, they feared that Muslims would return to their venturesome way of life. Therefore they applied their time-tested formula and herds of Christian missionaries started coming to India. They spread their network through the length and breadth of the country and started preaching to the Muslims the concept of "Kingdom of God". One outcome of this preaching was Mirza Ghulam Ahmad of Qadiyan. [19] He himself admitted that his movement was the product of the seed sowed by the British. Apart from his fabricated 'revelation' he also preached against the concept of *jihad*. He said:

O Friends! Now abandon the idea of jihad
From now on, religion prohibits battle and war.

The result of this versified propaganda was that Muslims began to feel embarrassed at the mere mention of *jihad*. Even the attitude of those who did not accept the prophethood of the Qadiyani became apologetic. They began to desire for a Quran that had no verses on *jihad*. But this was not possible. Therefore, they began

to offer ridiculous interpretation of the verses related to *jihad*: they said that the verses about *jihad* were time-bound and related to the period when the world had not become cultured – a time of madness and barbarity. The *jihad* instructions were appropriate then because the Arabs were naturally militant: but now all these verses have been abrogated.

The Message of Iqbal

This conspiracy was at the verge of becoming victorious when, fortunately for the Muslim community, Sir Muhammad Iqbal arrived on the scene and presented the real teachings of the Quran to the world.

Curse on the community is the leadership
That is secretively disciple to Pharaoh's power [20]

And Iqbal asked the 'considerate friends'-

To protect the pomp and presage of the Wrong
Europe armed herself from head to toe.
O supporter of the Church!, I ask thee
Is war evil only in the West and not in the East?
If thou art just, not pertinent is it that
Europe were forgiven and Islam be called to account. [21]

The modern Muslim is indebted to Iqbal who unveiled before him the truth of the Quran. Now, with the strength of his faith, he is presenting to the world the message of the Quran and also the attributes of the man (Prophet Mohammad (PBUH)) to whom the Quran was revealed.

O Heaven! Sprinkle dew on his tomb
O Bloom! O Harvest! Guard that house. [22]

Buddhism and Jainism

There is no doubt that both Buddhism and Jainism have preached sanctity of life. But the question is: what have they contributed to human civilisation? Throughout history, Jainism has never been a dominant force. And even today it does not have an independent identity. Thanks to Emperors Ashoka and Kanishka Buddhism did

[20] From *Nafsiyaat e ghulaami* (Psyche of Bondage) in Iqbal's *Zarb e Kaleem.*
[21] From *Jihad* in Iqbal's *Zarb e Kaleem.*
[22] Iqbal in *Waaleda Marhooma ki Yaad mein* (In Memory of Blessed Mother) in his *Baang e Draa*.

make some progress. But it took only one Hindu onslaught to drive the Buddhists out of India. Today, they are not recognised even as a minority community in India. It happened because these religions and their philosophies advocate salvation for individual life and are not concerned with collective life. At the time when Christians also believed in this philosophy their condition was not dissimilar to the Buddhists and the Jains. Dean Inge states that on the individual as well as universal level Christianity was only a religious movement.

The state of the Hindu religion is also the same. Mahatma Gandhi writes:

> If I were a dictator, religion and State would be separate. I swear by my religion. I will die for it. But it is my personal affair. The State has nothing to do with it. The State would look after your secular welfare, health, communications, foreign relations, currency and so on, but not your or my religion. That is everybody's personal concern! [23]

Government and Power

We have already stated that Islam is not a religion; it is a *Deen* that includes both religion and government. Look at any government, at every step it has to fight a war. What is war? It is to make somebody to accept something by force. We see that governments have to use force on a regular basis. When a criminal breaches peace, the police is ordered to arrest them. The criminal and the police both make use of their power against each other. The stronger dominates the weaker. Often the criminal is killed in such an encounter. But if he is arrested alive, his power (weapons, etc.) is snatched from him. He is tried in the court of law and if proven guilty, he is punished. This punishment is again implemented by force. This is called establishing peace in the land and is the basic obligation of an organised government. So, force is being used at every step and no Christian mystic or Hindu saint opposes it. They bless a government that establishes peace in the land. But when, instead of one individual an entire nation or community starts looting people, the use of force (war) against them is considered madness and barbarity. This shows that this philosophy is defective and trivial.

Resisting Evil

The Quran contains eternal truths. Therefore, it does not get influenced by cheap emotions and give these types of superficial 'moral laws'. To resist Evil is the

[23] *Harijan*, 22 September 1946: Talk with a Christian Missionary. *Collected Works of Mahatma Gandhi*, Vol. 92 p.190.

fundamental principle of the *Deen*. It states that all evil should be eradicated and resisted. [24]

> (O Messenger) repel evil (judiciously) with that which is best. (23:96)

The Quran accepts that some evils are committed inadvertently. Appealing to one's intellect and sagacity can resist this type of evils. This is called "resisting evil with good":

> The Muslim community) averts evil with good and keeps open for human welfare that which We have given to them. (28:54)

The Quran states that by 'resisting evil with good' even an enemy can become a friend:

> Nor can Goodness and Evil be equal. Repel (evil) with what is better then will he between whom and thee was hatred become, as he were thy friend and intimate. (41:34)

The Quran, however, does not negate human emotions and therefore it does not limit itself to the above instructions. It considers the other side of the coin also. It states that amongst the evildoers there are such persons who deliberately violate the laws. They do not listen to any reasoning and soft approach towards them makes them more extremist. This type of evil can only be arrested by force and deserve punishment becomes.

> (Sometimes a culprit has to be punished but always keep this in mind that) the punishment should be equal (in degree) to the crime. (42:40)

The Quran also states that use of force for, or in support of, the oppressed is not a crime.

> You have no right to charge or question a person who defends (or take revenge) himself after he has suffered wrong. (42:41)

Use of force is a crime when it is used for oppression, transgression, cruelty, riots, etc.

---

[24] The elimination of wrong is the irreducible minimum of morality. (R. Briffault, *The Making of Humanity*.)

The blame is only against those who oppress men with wrongdoing and insolently transgress beyond through the land, defying right and justice for such there will be a chastisement grievous. (42:42)

As such, the Quran instructs Muslims to forgive and to pardon. But, along with this, punishment is also considered essential so as to maintain peace and justice. This punishment, when extended beyond individuals to nations or communities, is called war. These measures good if they are for protecting human rights but evil if they are used for personal interests.

This fact was most eloquently stated by the last Messenger. He was asked: one man fights for war booty, one person fights for fame, one person fights for bravery, one person fights for anger and revenge. Whose Jihad is right? He replied:

Wa man qatala litakuna kalimatal lahi hiyal uuliya fahua fii sabilillahi.

One who fights in order to ensure that Allah's law (of justice and fairness) reign supreme then his *jihad* is in the Way of Allah. (Sahih Bukhari)

==========

ENJOY YOUR STAY AT
HOTEL PARKWAY (PVT.) LTD.
NEAR RAILWAY STATION – LAHORE

ALL COMFORTS AVAILABLE:

- T.V. & FAX
- AIR-CONDITIONED
- TELEPHONE EXCHANGE
- CAR PARKING
- LIFT, INTERNET
- EXCELLENT SERVICE

PH:0092-42-36365908-12, FAX: 0092-42-36311923,
E-mail:hotel_parkway@yahoo.com